DUE DATE

Cl. No. ______ *Acc. No.* ______

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.



لوح و قلم

(شعراء دہلی نمبر)

سرپرست حاجی زین العابدین (پرنسپل)

نگراں : حفیظ عباسی
: مشیر جھنجھانوی

ایڈیٹرز: مسعود غنی (یازدہم)
: اعجاز احمد (یازدہم)

فتحپوری مسلم ہایر سیکنڈری اسکول دہلی ۶

سال : ۱۹۶۸ - ۶۹

مطبع : اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی ۔

تصاویر : امپیریل آفسٹ پرنٹنگ پریس دہلی ۔

ٹائیٹل : تاج محل پرنٹنگ ورکس دہلی ۔

آرٹسٹ : خالد رشید (ہشتم)

کاتب : سرفراز احمد (آفسٹ)

ذاکر حسین (لیتھو)

محمد حامد (لیتھو)

فہرست

سوانح اور نظمیہ شاعری

احوالِ واقعی

"لوح و قلم" کا "شعراء دہلی نمبر" غیر معمولی تاخیر سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ لیکن اس کا کچھ باعث تاخیر بھی تھا" وہ یہ کہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ شعراء کے خود نوشتہ سوانحی حالات، ان کا نظریۂ شعر اور ان کے منتخب اشعار بھی شامل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حاصل کرنے میں بہت سی دشواریاں تھیں لیکن اکثر شعرا نے ہمیں بھرپور تعاون دیا ہم ان سب کو تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں بعض اصحاب غالباً اپنی مصروفیات کے باعث ہماری مدد نہ کر سکے، اس کا ہمیں افسوس ہے۔ طوالت کے خوف سے تمام کلاسکی شعراء کے حالات اِس مجموعے کی زینت نہ بن سکے۔ البتہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ صفِ اول کے تمام دہلوی شاعر اِس مختصر شمارے میں شامل کر لیے جائیں۔

اِس شمارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں احسن اللہ بیاںؔ کا منتخب کلام معہ مختصر تعارف کے شامل ہے۔ بیاںؔ ان خوش گو شاعروں میں سے ایک ہیں جن کا کلام اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اردو ادب کے طالب علموں کو ان کا کلام پڑھ کر ان کا مقام پہچاننے میں یقیناً مدد ملے گی۔

ایڈیٹوریل بورڈ کی جانب سے ایک تجویز اس میگزین کے سرپرست اور اسکول کے پرنسپل جناب حاجی زین العابدین صاحب کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے کہ آئندہ سال دو میگزین شایع کیے جائیں ایک جونیئر سیکشن کے لیے اور دوسرا سینیئر سیکشن کے لیے تاکہ طلبا ر کے لیے دلچسپی کا سامان مختلف زاویوں کے ساتھ پیش کیا جا سکے اور وہ پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھیں۔

یہ بھی تجویز ہے کہ سینیئر سیکشن کا اگلا شمارہ 'شعراء دہلی' کے منتخب کلام پر مشتمل ہو۔ اس طرح وہ اِس

شمارے کا حصہ دوم ہوگا اور دونوں کے بالاستعیاب مطالعے سے " دہلویت " کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

پرنسپل صاحب محترم کی بلند ہمتی اور خوش ذوقی سے توقع ہے کہ ایڈیٹوریل بورڈ کی یہ اسکیم پسند کی جائے گی اور موصوف کی سرپرستی میں اگلے شمارے اس سے بھی بہتر طور پر پیش کیے جائیں گے۔

ہمارے لیے یہ بات بھی باعثِ افتخار ہے کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، صدر جمہوریہ ہند؛ جناب محمد شفیع صاحب قریشی، ڈپٹی منسٹر آف کامرس؛ جناب وریندر پرکاش، ڈائریکٹر آف ایجوکیشن، دہلی؛ پروفیسر عبدالعلیم صاحب، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ؛ جناب میر مشتاق احمد صاحب منیجر اسکول ہذا اور حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے " لوح وقلم " کے لئے نیک خواہشات بھیجیں ہم ان محترم وبزرگ ہستیوں کے بے حد ممنون ومشکور ہیں

ہم ان سب اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس میگزین کی تیاری میں ہماری مدد کی اور ہمیں توقع ہے کہ آئندہ بھی ہمیں اسی طرح کا تعاون حاصل ہوگا۔

ڈاکٹر نور نقوی صاحب نے اس اسکول کی ۱۵ سال تک خدمت کی ہے۔ اسکول کے ہر شعبے کی ترقی میں ان کا ہاتھ رہا ہے۔ دراصل یہ اسکول میگزین ان کی ہی کوشش اور عمل کا نتیجہ ہے اس کے لیے ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر موصوف کا تقرر مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں بہ حیثیت لیکچرار ہوگیا ہے۔ ہمیں ان کی ذات سے امید ہے کہ وہ ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

ایڈیٹرز

حاجی زین العابدین
(سرپرست)

پیامِ عمل

عزیزو ، علم کے طلب گارو ،

لوح و قلم کا دوسرا شمارہ اپنی منزلوں کو طے کرتا ہوا آج تمہارے ہاتھوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ یہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کے عملی تعاون کا نتیجہ ہے۔

اِس شمارے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں دہلی کے شعرائے کرام کے حالات آپ کے سامنے آئے ہیں۔ دلّی ہندوستان کا دل ہے جس میں ان ہی رنگین بیانوں نے اپنی زندگی گزاری اور اپنے بچپن اور جوانی کو دلّی کے گلی کوچوں میں پھر کر اُبھارا اور سجایا۔ ان لوگوں کا بچپن، ان کی جوانی اور جو کچھ دلّی کے اثرات تھے ان سے فائدہ اُٹھایا اور پھر وہ ایسے بن گئے جن کا ذکر گھر گھر میں ہوا اور اُن کی یادگاروں سے تاریخ کی زینت کا سامان ہوا۔ ان کی جدّت طرازیوں اور شیوہ بیانیوں کی دھوم مچی اور اب وہ لافانی یادگاروں کی صورت میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں، جنہیں ہم فخر سے بیان کرتے ہیں۔

اِن میں حضرت امیر خسروؔ ہیں، غالبؔ ہیں، ذوقؔ ہیں، مومنؔ ہیں۔ ان کے شاگرد ہیں اور پھر شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ اور جو صورتیں ہماری نگاہوں کے سامنے طلبا کے پیکر میں دکھائی دے رہی ہیں یہ سب ہیں۔ یقیناً تمہارے دل میں یہ ولولہ ہوگا کہ ہم میں بھی ایسے ہی جوہر پیدا ہو جائیں ہم میں بھی وہی اعلیٰ جذبات پرورش پا جائیں جس سے ہمارا ذکر کیا جائے اور مستقبل میں ہمارا نام لے کر بھی یادگاریں منائی جائیں۔

یاد رکھئے کہ یہ سب لوح و قلم کے کرشمے تھے اور اب وہی لوح و قلم کا پیکرِ کاغذی تمہارے لیے ترقّی کا پیام لے کر تمہارے سامنے آگیا ہے۔

عزیزو۔ قدرت نے وہی تمام قوتیں تمہیں بخشی ہیں جن سے تمہارے اسلاف مالا مال تھے۔

چاندی مٹی میں ڈال دی جائے، لوہا کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جائے۔ لعلِ بے بہا اور موتیوں کے قیمتی دانوں کو بکھیر کر خاک میں ملا دیا جائے تو سب ہی جانتے ہیں کہ ان کی آب و تاب اور قدر و قیمت

عارضی طور پر گھٹ جاتی ہے۔ لیکن اگر زنگ کو صاف کر دیا جائے، چاندی کو اُجال دیا جائے لعل بے بہا اور موتیوں کو سمیٹ کر چمکا دیا جائے تو پھر اُن کی قیمت بڑھ جانے سے کوئی اِنکار نہ کرسکیگا۔ انسانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والا علم ہے، علم کے ساتھ شائستگی ہے، غور و فکر اور مطالعہ ہے، محنت ہے۔

ابھی ابھی جن کے نام تمہارے سامنے لئے گئے ہیں ان سب نے علم و شائستگی مطالعہ اور محنت ہی سے یہ مقام حاصل کیا تھا جس کا آج ہر جگہ چرچا ہے، ہر جگہ اُن کا ذکر ہے، زبانوں پر بھی، تاریخ میں بھی۔ یہ فتح پوری مسلم اسکول جو تمہارا گہوارہ ہے، یہ اساتذہ، یہ تعلیم گاہ کا ماحول، یہ لائبریری، سب تمہارے سجانے اور تمہیں چمکانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ایک مشین ہے، کارخانہ ہے، جس میں محنت اور دل وجان سے لگے رہنے میں ہر پرزہ چمک جائے گا اور ایسا بن جائے گا کہ ہزاروں اپنے جیسے پُرزے بنا سکے گا۔ یہ بکھرے ہوئے موتی، یہ مختلف مضامین اور رنگا رنگ موضوعات جن سے تمہارا واسطہ ہے جب گلدستہ کی شکل میں آجائیں گے۔ تو ایک ایسا بیش بہا تحفہ بنے گا کہ ہر ایک اِسے دیکھے گا اور تحسین وستایش کرے گا۔

میرے عزیزو! علم اور دانش نہ فقط اس دنیا کا سرمایہ ہیں بلکہ انسان جب دُوسری دنیا میں جاتا ہے تو یہی علم اس کے کام آتا ہے۔

رسول کریمؐ نے فرمایا ہے، مرنے کے بعد دو چیزیں کام آتی ہیں،

"علم جسے پڑھا اور پڑھایا اور اولاد نیک"

یہ تمہارا اسکول علم بھی سکھاتا ہے، اور نیک اولاد کی تعریف بھی اِس کے ذریعہ سے حاصل ہوجاتی ہے۔ دُنیا میں اِسی علم کے ذریعہ بڑے بڑے مناصب ملتے ہیں، علم ہی سے حکمت وسیاست حاصل ہوتی ہے، جس سے حکومت تک حاصل ہوتی ہے اور علم ہی سے خدا شناسی پیدا ہوتی ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔

یہ بیرسٹر، یہ وکیل، یہ بڑے بڑے پروفیسر، بڑے بڑے انجینیر، ڈاکٹر اور سیاسی رہنما اسی علم سے بنے ہیں جس کا اشارہ تمہارے سامنے مختلف موضوعات اور گلدستہ کی مثال دے کر بیان کیا گیا ہے۔

پس اے میرے نوجوان عزیزو اور علم کے طلب گارو لوح وقلم سے واسطہ رکھو، محبت کرو، محنت کرو اور مضبوطی سے اس پر جمے رہو۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم ❖ قلم کش را بدولت می رسانم
اگر بدبخت باشد من چہ دانم ❖ ولے یکبار دولت را رسانم

تم نے سنا قلم نے کیا کہا، اس نے کہا:

"میں دُنیا کا شہنشاہ ہوں،

میں ہی اسے دولت اور خزانہ کا مالک بناتا ہوں جو مجھ سے کام لینا چاہتا ہے۔ اگر کسی کا نصیبہ بھی بلند نہ ہو تو کم ازکم ایک مرتبہ تو اُسے دولت تک پہونچا ہی دیتا ہوں"

دیکھو سارے جہاں اور پوری کائنات میں قلم ہی کی فرماں روائی ہے۔

یہ بڑے بڑے اخبار جو ملکوں کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں قلم ہی کے ضرورت مند ہیں۔ اور اسی کے بل پر چل رہے ہیں۔

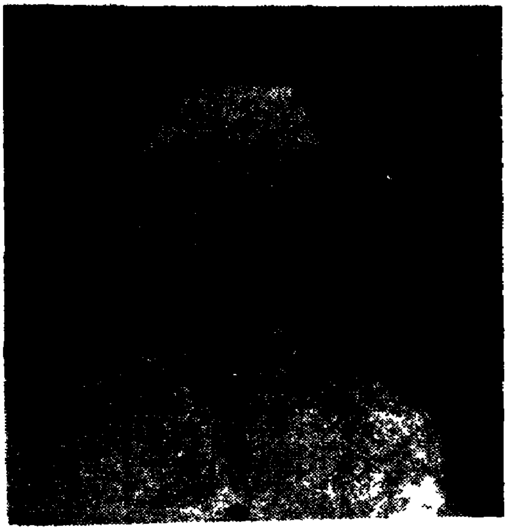
اے میرے عزیزو۔ تم اگر سوچو گے تو پوری طور پر سمجھ لو گے کہ اسی قلم اور لوح کے نوشتے دنیا اور دین کی ہر ایک جنبش اور حرکت پر قابض ہیں۔ لوح وقلم کی حکمرانی زندہ باد۔

آخر میں میری دُعا ہے کہ خُدا تعالیٰ تمہارے دل میں لوح وقلم کی سچّی محبت پیدا کر دے اور تم اس کی طاقت سے اس دنیا میں خوش بختی اور حکمرانی، خُوش حالی اور چین واطمینان کی زندگی گزارو۔ کہ یہ لوح وقلم کے اشارے تمہارے ہی ہاتھوں اور تمہاری ہی نگاہوں کے پروردہ ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم اس اسکول میگزین کے مطالعے سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاؤ گے۔

زین العابدین
سرپرست، "لوح وقلم"

राष्ट्रपति भवन, नई दिल्ली-4.
RASHTRAPATI BHAVAN,
NEW DELHI-4.



مورخہ ۳۰ جنوری ۶۹ء

مکرم بندہ ـــــ السلام علیکم

نوازش نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ فتحپوری مسلم
ہایر سکنڈری اسکول دہلی سے ایک جریدہ بنام
"لوح وقلم" اُردو زبان میں ہر سال شایع ہوتا ہے۔
اور اس سال بھی یہ جریدہ شایع ہو رہا ہے۔ خُدا
آپ سب کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔ جریدہ
کی کامیابی کے لئے میری دُعائیں اور نیک خواہشات
قبول فرمائیں۔ والسلام

مخلص

جناب زین العابدین صاحب
پرنسپل فتحپوری مسلم ہایر سکنڈری اسکول۔ دہلی

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نیک خواہشات
ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہیں مگر ہماری
بدقسمتی ہے کہ آج وہ خود ہمارے درمیان
نہیں۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے
اور ہم سب دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ
مرحوم کو مغفرت عطا فرمائے۔ آمین۔

وریندر پرکاشش

D. O. No. ADE(...)/...173
DIRECTOR OF EDUCATION,
DELHI ADMINISTRATION.

Dated Delhi, the... 14/2/...

جناب زین العابدین صاحب
پرنسپل فتحپوری مسلم ہایر سکنڈری سکول - دہلی -

آداب و نیاز -

مجھے یہ جان کر مسترت حاصل ہے کہ آپ کا مدرسہ ایک میگزین بنام "لوح و قلم" شایع کر رہا ہے -

مجھے یقین ہے کہ آپ کا میگزین سکول کے کارناموں کا ایک آئینہ ثابت ہوگا اور بچّوں کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع ملے گا اور ان کی حوصلہ افزائی ہوگی -

میں میگزین کو دیکھنے کی دِلی خواہش رکھتا ہوں -

آپ کا

[signature]

(وریندر پرکاشش)

وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی
علیگڈھ

۵؍جنوری ۱۹۶۹ء

مکرمی تسلیم

آپ کا خط ملا۔ ممنون ہوا۔

آپ نے اپنے اسکول کے جریدے "لوح وقلم" کے لئے مضمون کی فرمائش کی ہے۔ ان دنوں میں بے حد مصروف ہوں، علمی کام کرنے کے لئے وقت ہی نہیں مل پاتا، ورنہ تعمیلِ ارشاد کرتا۔

فتح پوری مسلم ہایر سکنڈری اسکول دہلی کے جملہ طلباء کے لئے میری دُعائیں قبول کیجیے۔ مجھے توقع ہے کہ طلباء ڈِسپلن اور تعلیم کے میدان میں اپنا قومی وقار مدِّنظر رکھیں گے، کیوں کہ میں طلباء کو قوم کی امانت سمجھتا ہوں اور استاد کو امین۔

مخلص

عبدالعلیم

(پروفیسر عبدالعلیم)

مت جناب زین العابدین صاحب
ل فتح پوری مسلم ہایر سکنڈری اسکول دہلی۔

GOVERNMENT OF INDIA
DEPUTY MINISTER OF COMMERCE

New Delhi, 2...2.........1969



مکرمی زین العابدین صاحب

تسلیمات ۔

مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ ہمیشہ کی طرح اس سال بھی 'لوح وقلم' شائع کیا جا رہا ہے۔ گو مجھے پہلے یہ جریدہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا مگر یقین ہے کہ علمی خدمات کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے قابل تعریف ہے۔ اور 'لوح وقلم' بھی اس خدمت میں پیش پیش ہوگا۔

تعلیم ہر ہندوستانی شہری کے لئے ضروری ہے۔ اور بچوں کو اگر ابتدا سے ہی صحیح تعلیم دی جائے تو اُن کا ذہن اور دماغ صاف رہتا ہے اور وہ بڑے ہو کر اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ خاص طور آج کل کے دنوں میں جب کہ فرقہ پرست طاقتیں بچوں کے ذہن کو زہر آلودہ بنا کر اُن میں نفرت اور حقارت کا بیج بو رہی ہیں آپ کے ادارہ پر اور زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے

مجھے اُمید ہے کہ فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری سکول مستقبل کے ہندوستان کے لیے نئے معماروں کو تربیت دینے کا کام زیادہ تن دہی سے کرتا رہے گا۔ میری دُعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو اپنے نیک ارادوں میں کامیابی بخشے۔ آمین۔

خیر اندیش

محمد شفیع قریشی

Phone.- 262815

Mufti Atiqur Rehman Usmani

Burhan office
Jama Masjid Delhi 6

Dated 25...3...196—



برادرم ! السلام مسنون!

آپ کا خط ملا۔ یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ اس سال "لوح و قلم" ایک نئی شان اور نئے انداز نکل رہا ہے میری خواہش تھی کہ کوئی چھوٹا سا مضمون لکھ کر، نوجوان قلم کاروں کی صف میں شامل ہوتا مگر ہنگامی مصروفیتوں نے کہیں کا نہیں رکھا۔

"شعرائے دہلی نمبر" نکال کر عزیز طلبہ نے ایک مفید اور دلپذیر پروگرام کی تکمیل کی ہے۔ اس نمبر کو پڑھ کر ان کے ہم جماعت تاریخ ادب اُردو سے روشناس ہوں گے۔ اور اپنی آئندہ علمی زندگی میں اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ اور یہ ان کے لیے ایک ادبی دستاویز ہوگی۔ یقین ہے کہ اس کو پڑھ کر طلبا میں صحیح علمی ذوق پیدا ہوگا۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے۔

آمین

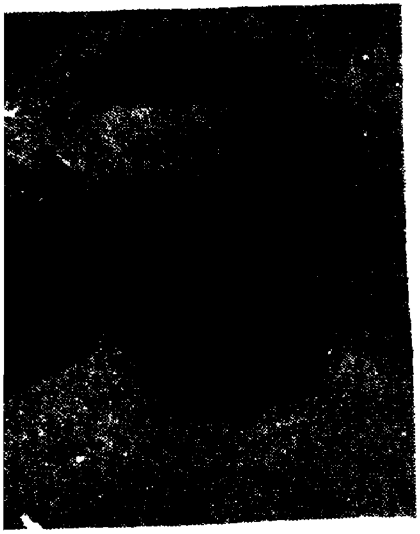
عتیق الرحمٰن عثمانی

Phone : 261662

Mir Mushtaq Ahmed

Aruna Hall,
Urdu Bazar,
DELHI-6.

۱۸ فروری ۱۹۶۹ء



"لوح وقلم" رسالہ فتحپوری مسلم ہایر سیکنڈری اسکول کے ہونہار نونہال شایع کرتے ہیں ـــــ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ بچّوں میں ابتدائی عمر میں ایسا شوق پیدا کرنا اساتذہ کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ اللہ تعالےٰ ان نونہالوں کو سعادتمندی عطا کرے۔ میں اِس رسالے کی اشاعت پر دِلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

اِس موقع پر علامہ ابوالکلام آزاد کا ایک مقولہ نذر کرتا ہوں۔

"صداقت اپنے حامیوں کی کثرت وقلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پرواہ رہی ہے، ہمیشہ رہے گی، سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت نہیں ہے اس کے لیے تو اتنا کافی ہے کہ وہ سچ ہے۔" آخر میں علامہ اقبال کا شعر یاد کر لیجیے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

میر مشتاق احمد احقر العباد

میری گزارش



ممبرانِ منتظمہ سے!

وعتصموا بحب اللہ جمیعا

پرنسپل واساتذہ سے!!

سالانہ امتحان کی تیاری کے لیے طلبا کو آپ تربیت بھی دیتے ہیں اور زیور تعلیم سے آراستہ بھی کرتے ہیں۔

کچھ مخصوص طلبا ہر سال ایسے بھی ضرور پیدا کریں جو آپ کی خصوصی توجہ سے آئندہ زندگی میں سکول کے قیام و استحکام میں ممد و معاون بھی ہوں۔ اور وقتِ ضرورت نظام الفرام بھی سنبھال سکیں۔

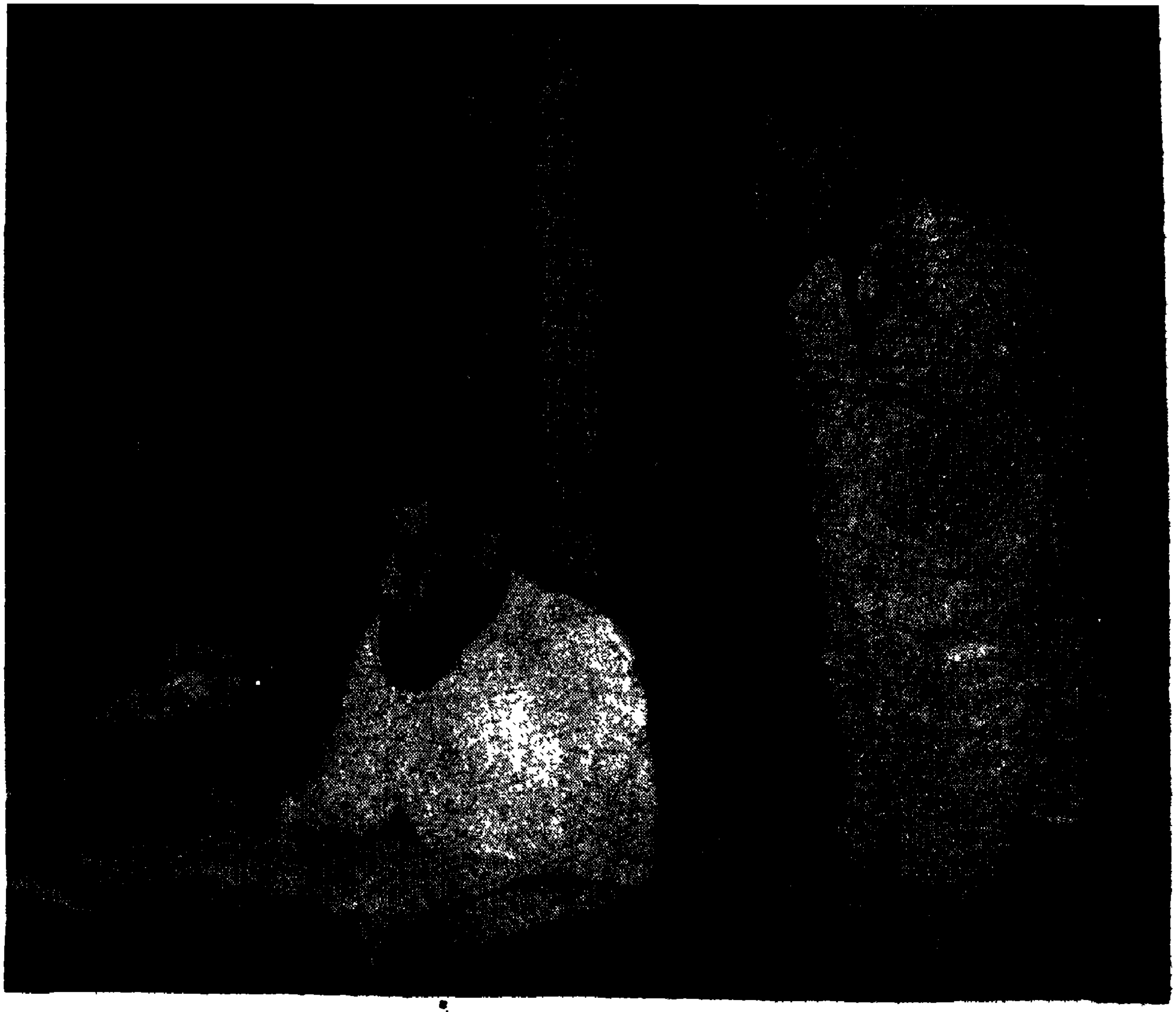
میرا ان سب لوگوں کو ہدیۂ تہنیت پیش ہے جنھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے اسکول کی قدیم روایات کو نہ صرف قایم رکھا ہے بلکہ اسی کی ترقی میں مصروف ہیں۔ اللہ رب العزت ان سب کو اپنی اپنی جگہ کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

لوح و قلم کے اس شاندار مجلّہ کے شایع کرنے پر کارکنان مستحق مبارکباد ہیں۔

عزیز طلبا سے: کل آنے والے امتحان کی تیاری آپ نے سال بھر کی ہے لیکن روزِ محشر کے لیے آپ کو یہ تیاری عمر بھر کرنی ہے۔

[signature]

۲۲.۱.۶۹.



جناب زین العابدین صاحب (پرنسپل)



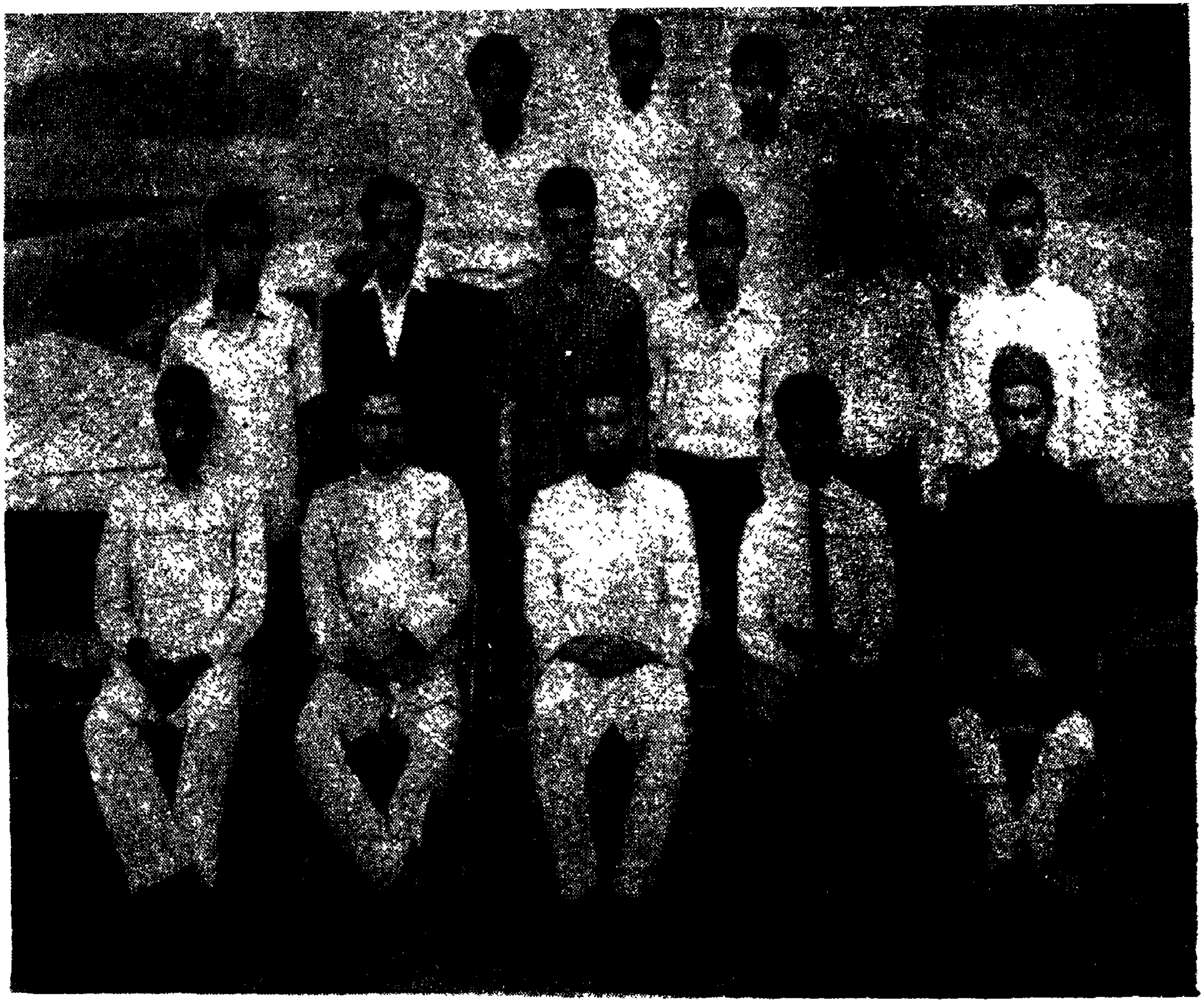
ایڈیٹوریل بورڈ

(دائیں سے بائیں) اعجاز احمد (یازدہم)، حنیظ عباسی - حاجی زین العابدین - مشیر جھنجھانوی - مسعود غنی (یازدہم)



لوح و قلم (وال میگزین) (ایڈیٹوریل بورڈ)

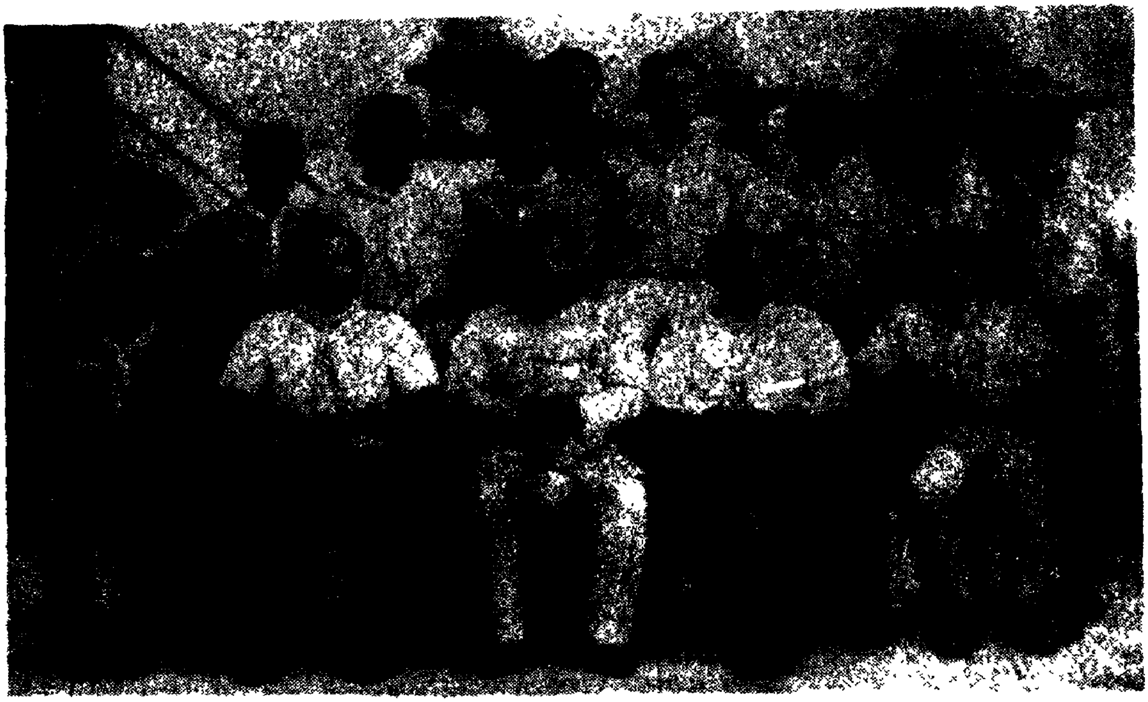
اعجاز احمد (یازدہم)



(۱۹۴۸–۴۵۱ ط ا.لہ ا کا



اسٹاف ، فرسٹ شفٹ (۶۹-۱۹۶۸)



اسکاوٹنگ (۶۹-۱۹۶۸)



اسٹاف، سیکنڈ شفٹ (۶۹-۱۹۶۸)



کرکٹ ٹیم (۱۹۶۸-۶۹)



فٹ بال ٹیم (۱۹۶۸-۶۹)



اتھلیٹک ٹیم (۱۹۶۸-۶۹)

دہلویت کا مفہوم

دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے فرق کو سمجھنے کے لیے دونوں مقامات کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد شاہان مغلیہ کی شان و شوکت اور دبدبہ ایک بھولی ہوئی داستان ہو کر رہ گیا۔ آئے دن دہلی، حملہ آوروں اور مفسدوں کے غیض و غضب کا نشانہ بن کر اجڑتی رہتی تھی۔ اہلِ کمال پر جب عرصۂ حیات تنگ ہوا تو وہ دہلی سے کوچ کرنے لگے۔ ایک درد کے قدم تو نہ ڈگمگائے ورنہ سبھی اس اجڑے دیار کو خیر باد کہہ گئے۔ وہ سودا جنھوں نے شجاع الدولہ کے دعوت نامے کے جواب میں یہ رباعی لکھ بھیجی تھی۔

سودا پۓ دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

لیکن یہی سودا گردشِ زمانہ کے ہاتھوں لاچار دہلی سے نکل کر فرخ آباد کا رخ کرتے ہیں اور بالآخر اودھ کے دربار میں جا حاضر ہوتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو دہلی آلام و مصائب کا گھر بنی ہوتی تھی دوسری طرف لکھنؤ میں آصف الدولہ جیسے لکھ لٹ اور بے فکرے نواب کی محفل جمی ہوئی تھی۔ آصف الدولہ کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ صبح کو جب دوکاندار آصف الدولہ کا نام لے کر ترازو اٹھاتے تھے غرض شعرا نے دہلی سے نکل کر لکھنؤ کا رخ کیا۔

دہلی کی زندگی اس وقت مصیبتوں سے عبارت تھی تو لکھنؤ میں بے فکری اور تن آسانی میسر تھی دولت کی فراوانی نے امرا کو عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ خود آصف الدولہ بہت سی اخلاقی کمزوریوں کا شکار تھے۔ شاعری کا اس ماحول سے متاثر ہونا لازمی امر تھا، عیش و کامرانی کی یہ لے پوری شاعری پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شاہان اودھ اہل تشیع تھے۔ ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے پہلے تصوف کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لہٰذا یہاں بھی تصوف کی جڑیں نہ جم سکیں پھر عیش اور فارغ البالی

یوں بھی توکل اور استغنا کی نفی کرتی ہیں۔ برخلاف اس کے دہلوی شعرا تصوف سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے "دلی کا دبستانِ شاعری" میں دونوں اسکولوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ "ایک جگہ آہ ہے تو دوسری جگہ واہ۔ دلی کا تمدن زندگی کا المیہ رخ پیش کرتا ہے تو لکھنؤ کا طربیہ۔"

لکھنؤ میں طوائفوں کی گرم بازاری تھی۔ ان میں بہت سی خیمہ دار تھیں اور ان کے خیمے سفر میں امرا کے خیموں کے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ متعہ کا رواج بھی عام تھا "حسن" خود وصل کا طلبگار تھا اس لیے محرومی و ناکامی یا ہجر کی ذہنیتوں سے اسے واسطہ ہی نہ پڑتا تھا دہلی میں ان چیزوں کو معیوب خیال کیا جاتا تھا اس لیے شعرائے دہلی کا معشوق پردہ دار تھا۔ اور ہجر شعرائے دہلی کا مقدر تھا۔ اس لیے ان کے کلام میں حزنیہ عنصر غالب ہے کہیں دیدار کی خواہش کا اظہار ہے کہیں وصل کی آرزو کا مثلاً

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے
——— میر

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

پھٹ چکا جب سے گریباں اپنا
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے در تک آ کے
ہم سے کتنے بکھرے بیٹھے ہیں
——— مصحفی

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

میرے احوال پہ نہ ہنس اتنا
یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے
——— درد

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں
——— سودا

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر
کرنے کو کی یہ راس نہ آئی وفا مجھے

یقین مار گیا جرم محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں شہادت اس کو کہتے ہیں
——— یقین

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ
دیکھا مزا نہ تو نے، نادان! عاشقی کا

اشک خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے
دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے
——— سوز

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
دل مژہ تک پہنچ چکا ہوں اشک
اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے
_____ قائم

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا
کیا ہنسے اب اور کوئی کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا
_____ حسن

بہاریں ہم کو بھولیں یاد آتا ہے کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا
کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے
_____ حسرت

کب کب گلی میں تیری ہم بے قرار آئے
سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں
_____ اثر

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
_____ غالب

اس کے برعکس شعرائے لکھنو کے کلام میں وصل کے مزے لوٹنے کا بیان ہے۔ معشوق کے دھندلے دھندلے تصور کی جگہ اس کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ محبوب کا سراپا ہے۔ آرائش حسن کا ذکر ہے۔ بناؤ سنگھار چوٹی موباف کی باتیں ہیں۔ آئیے اب شعرائے لکھنو کے کلام کا جائزہ لیں:۔

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
_____ انشاء

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن گدرایا ہوا
_____ جرأت

کیا غضب تھا پھاند کر دیوار آدھی رات کو
دھم سے میرا کودنا اور وہ تمہارا اضطراب
اس مٹھو سے پن پہ میٹھے کس قدر ہیں شیخ جی
توند تم ان کی نہ سمجھو ہے یہ ٹسکا راب کا
مزے خوب لوٹو گے کیوں شیخ صاحب
ملیں گی بہشت بریں میں اگر پر
زمرد کی اک چونچ ہوگی بڑی سی
تو مارو گے ٹھونگ اس سے ہر اک ثمر پر
_____ انشا

اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے

کہ لکھنوی شاعری بے راہ روی کا شکار ہو گئی تھی اور عشق کے پاکیزہ جذبات ہوس رانی کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ انگریزوں کے مشورے پر شاہانِ اودھ دہلی کی رسمی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ اس انحراف کے ساتھ دہلی اور دہلی کے اثر سے آزاد ہونے کی دانستہ کوشش کی گئی۔ چنانچہ شعرا نے بھی نئی روائتیں قائم کیں اور لکھنوی شاعری کو دہلوی شاعری پر ممتاز کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں اکثر جگہ لغزش ہوئی لیکن لکھنوی شاعری کو یکسر سوختنی قرار دینا سراسر زیادتی ہے اس اسکول نے دو طرح اردو شاعری کی زبردست خدمت کی۔ اس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

بعض شعرا لکھنو میں رہائش کے دوران جذباتی طور پر دہلی سے ہی متعلق رہے۔ حد یہ ہے کہ انیس اپنی زبان کو لکھنوی شعرا سے الگ 'دہلوی زبان' کہنے پر فخر کرتے تھے اور زبان اور محاورے میں اپنے آباء کی پیروی کو باعث فخر خیال کرتے تھے مصحفی ان سب میں سر فہرست ہیں۔ وہ لکھنو میں بیٹھ کر اہل لکھنو پر طنز کرتے ہیں اور دہلی کو یاد کرتے ہیں:

کو لہجۂ دہلی و کجا لہجۂ پورب
تم ان کی طرف ہوتے ہو ناحق کو زنا لو!

لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ مصحفی لکھنو کے ماحول سے متاثر نہ ہوئے۔ لکھنوی اثر دھیرے دھیرے ان کی شاعری پر اثر کرتا رہا۔ ان کے کلام میں جرأت اور انشا کا رنگ تلاش کر لینا کچھ مشکل کام نہیں لیکن اس طرح مصحفی نے نادانستہ طور پر ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی جسے دہلی اور لکھنو کی صحت مند اقدار کا امتزاج کہنا چاہیے اور انھوں نے بعض ایسے شعر کہے جنھیں دہلویت اور لکھنویت یا زیادہ واضح الفاظ میں داخلیت و خارجیت کا معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

پہنچے کو چھوڑا تو گلے پڑنے مرے ہو لیے
تم پہلے مرے ہاتھ سے دامن تو چھڑا لو

کیا قیامت ہو کہ کھینچوں میں ترے دامن کو
اور ترے ہاتھ میں ہو چاکِ گریباں میرا

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی جی کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی جی کو
یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ وہاں زلفِ دوتا لے گئی جی کو

آخری شعر نے میر جیسے بد دماغ سے بھی داد وصول کر لی تھی۔

مصحفی کے بعد ان کے شاگردوں بالخصوص آتش نے اس رنگ کو پروان چڑھایا اس کے بعد اسیر، امیر اس رنگ کی کامیاب پیروی کرتے رہے اور پھر حسرت نے دہلی اور لکھنو اسکول کی خصوصیات کو بالکل ہی شیر و شکر کر دیا

لکھنو اسکول کا سب سے بڑا احسان اردو شاعری پر یہ ہے

بقیہ صفحہ ۲۱ پر

سید اعجاز احمد بازیدہم ہل

"دلّی سے متعلق ضرب الامثال"

۱ دلّی دور ہے (منزلِ مقصود دور ہے)
۲ دلّی کی کمائی، بھنگ کے بھاڑے میں گنوائی۔ (دولت مفت میں گنوائی، ساری عمر کی محنت رائیگاں گئی)
۳ دلّی کی کمائی، دلّی ہی میں گنوائی (سب کچھ خرچ کر دیا، ایک پیسہ پاس نہ رکھا۔)
۴ دلّی کا روڑا (بہت ہوشیار)
۵ تھوڑا کھانا دلّی میں رہنا۔
۶ بے زر کا مرد بلّی گھر میں رہے کہ دلّی۔
۷ آس پاس برسے دلّی پڑی ترسے
۸ دلّی دکھانا۔ (بچوں کو بطور کھیل کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر سے اونچا کرتے ہوئے)
۹ دلّی کا کوتوال (بہت دبدبے والا)
۱۰ دلّی سے میں آؤں، خبر کہے میرا بھائی (جب کوئی شخص پرائی خبر سنائے)
۱۱ کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر۔
۱۲ ہنوز دلّی دور است
۱۳ دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار   اور بستی نہیں یہ دلّی ہے۔
۱۴ بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا۔ (اچھی جگہ رہنے کے باوجود قابل نہ ہوئے۔)
۱۵ دلّی سے ہینگ آئی تب بڑے پکے (بڑی مشکل سے کام ہونے کے بعد کہتے ہیں۔)
۱۶ دلّی کے بانکے جن کی جوتی میں سو سو ٹانکے (دلّی کے بانکے کیسے ہی غریب کیوں نہ ہوں، رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں)
۱۷ دلّی دکھنی نہیں بن گئے شاہجہاں آبادی۔
۱۸ دلّی کی بیٹی متھرا کی گائے   کرم پھوٹیں تو باہر جائیں۔ (غیر قوم میں شادی کرنا)
۱۹ دلّی کے دل والے منہ چکنا پیٹ خالی۔ (دلّی کے رہنے والے گو بہت بن سنور کر رہتے ہیں، مگر بھوکے مرتے ہیں۔)

محمد مجیب خاں

امیر خسرو

دہلی سے چار پانچ میل جنوب مغرب میں ایک بستی نظام الدین کے نام سے واقع ہے۔ یہ پرانی بستی کچھ ویران سی ہے لیکن اب اس کے گرد و نواح میں کافی توسیع ہو گئی ہے۔ یہ پرانی بستی باوجود اپنی ویرانی اور بے سروسامانی کے اہلِ دل اور صوفیانِ باصفا کی زیارت گاہ ہے اور کیوں نہ ہو یہاں ہندوستان کے مشائخ کبار۔ اللہ کے سچے بندے بڑے بڑے عابد، زاہد یوں پیوند زمیں ہیں۔ کون ایسا شخص ہے جس نے ایک نہ ایک بار نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سترہویں میں شرکت نہ کی ہو اور وہاں کے مقدس مزارات پر جا کر فاتحہ خوانی کا شرف حاصل نہ کیا ہو۔ آئیے اس طوطیٔ ہند کی زندگی کے حالات پر اجمالاً نظر ڈالیں۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود دہلوی کے والد ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے تھے۔ منگولوں کے ہنگامہ میں ایک بڑی مخلوق وہاں سے فرار ہو گئی چنانچہ جس کو جہاں موقع ملا سر چھپایا۔ امیر خسرو کے والد ہندوستان کی طرف چلے آئے اور ضلع ایٹہ میں پٹیالی میں آکر رختِ سفر کھولا۔ امیر خسرو اسی شہر میں ۶۵۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ کے والد عالم اور فاضل تھے اس لیے امیر خسرو نے بھی علوم و فنون کی تحصیل شروع کر دی اور اپنی قومی زبان فارسی کے آثار اور اشعار کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنے لگے۔

امیر خسرو دہلی رہے۔ دہلی کے بادشاہوں کے یہاں آپ کی بڑی عزت تھی۔ ان میں سے بعض سلاطین کی آپ نے اپنے اشعار میں مدح بھی کی ہے اور ان کا نام بھی لیا۔ امیر خسرو صوفی بزرگ اور مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ خسرو نے آپ ہی سے روحانی تعلیم حاصل کی اور انھیں سے سلوک، طریقت، ریاضت، اور درویشی

کی باتیں دیکھیں۔ امیر خسرو نے بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھیں۔ ان کے والد جس وقت ہندوستان آئے دلی میں غلام خاندان کی حکومت تھی اور سلطان التمش کا زمانہ تھا۔ امیر خسرو نے خود بلبن سے لے کر تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز رہے لیکن حضرت نظام الدین کے حلقہ میں آنے کے بعد شاہی ملازمت سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ کئی مرتبہ درخواست کی کہ ان کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے لیکن بادشاہِ وقت مصر تھا۔ آخر کار اس کی مرضی کے خلاف دربار سے کنارہ کر لیا اور اب دوسری زندگی شروع کر دی۔

امیر خسرو پر کہاں تک قلم اُٹھایا جائے۔ اُن کی کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔ اگر ایک طرف شاہی اعزاز سے مشرف تھے تو دوسری طرف طبیعت میں استغنا اور بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تو ایسے شخص تھے کہ صوفیوں میں صوفی اور عوام میں سب کا پیارا اور چہیتا خسرو اگر آج فارسی کے شعر کہہ رہے ہیں تو کل ہندوستانی زبان میں پہیلیاں دوسخنے اور کہ مکرنی کہہ رہے ہیں۔ آج دربار میں ہیں تو اگلے دن محفلِ سماع جم رہی ہے۔ آج کسی اور کے دربار میں گئے ہیں تو کل لوگ ان کے دربار میں آرہے ہیں۔ نسلاً ترک ہے لیکن روح ہندی ہے۔ باپ دادا کی زبان فارسی ہے لیکن عوام کے دل عوام کی زبان سے موہ لیتا ہے۔

امیر خسرو صرف خواص میں ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی ہر دلعزیز تھے اُن کے لئے حریف و ظریف تھے۔ امیر خسرو کی پہیلیاں ان کے راگ ان کی مکرنیاں ان کے دوسخنے آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ قارئین کی دل چسپی کے لیے ہر ایک کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ پڑھنے والوں کی زبان چٹخارے نہ لے اور چھوٹے اور بڑے اپنے اپنے گھروں، اپنی اپنی محلوں اور نشستوں میں ان کو سامانِ تفریح نہ بنا لیں اب یہ کام آپ کا ہے کہ بتائیں کہ یہ کیا کیا چیزیں ہیں۔

۱

ترور سے ایک تریا اُتری اُس نے بہت رجھایا
باپ کا اُس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

۲

فارسی بولی آئینہ
ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے
منہ دیکھو جو اُسے بتائے

۳

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی سوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے

پانس کا سنہ دن کا باشا۔ یاشے کا دہ کھایا
سنگ ملے تو سر پر اکھیں واہ کو را دراجا
سی بھی کر کے نام بتایا میں بیٹھا ایک
اٹھا سیدھا پھر دیکھو دیا ایک کا دیک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال
عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلّی کیا بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہاروں میں گھم گڑواتی ہیں۔ پیڑوں میں جھولا ڈلواتی ہیں۔ مل مل کر جھولتی ہیں اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ایسے موقعوں کے لیے بھی امیر خسرو نے گیت لکھے ہیں۔ خاص طور پر یہ راگ بھی انہیں کا ہے۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گائے۔ آج ہوئے کل بھول گئے۔ چھ سو برس گزرے یہ آج تک ہیں اور ہر برسات میں ویسا ہی لطف دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جو پیا آون کہہ گئے ابھوں نہ آئے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لیے تو ایسے گیت تھے۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پیا یا سوامی کا کہاں ذکر کر سکتی ہیں۔ اُن کے لیے اس طرح کا گانا مناسب نہ تھا لیکن دل میں امنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ امیر خسرو نے اُن کے لیے یہ گیت دے دیا۔

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

اب آئیے دو تین مکرنیاں بھی پڑھیے اور دل ہی دل میں بوجھیے۔

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

سر پر سلونا سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن نا سکھی لون

وہ آوے تب شادی ہووے
اس بن دوجا اور نہ کووے
میٹھے لاگیں وا کے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

ایک کنویں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو پیاس لگی اور کنویں پر جا کر

[illegible] چاروں کہنے لگیں کہ ہمارے لیے کوئی
[illegible] تب پانی پلائیں گے۔ چاروں نے
[illegible] چھیڑ۔ ڈھول اور کتا کے الفاظ بتائے
اب سنیے امیر خسرو کیا کہتے ہیں۔

کھیر پکائی جتن سے اور چرخہ دیا جلائے
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجائے
لا پانی پلا۔

چلتے چلتے ایک ڈھکوسلا بھی سنتے جائیے۔

بھادوں پکی پیپلی۔ چو چو پڑی کپاس
بی مہترانی دال پکاؤگی یا ننگا

لیجیے اب اپنے کانوں میں کچھ دو سخنوں کا بھی رس ڈالیے۔

گوشت کیوں نہ کھایا
ڈوم کیوں نہ گایا
جوتا کیوں نہ پہنا
سنبوسہ کیوں نہ کھایا
انار کیوں نہ چکھا
وزیر کیوں نہ رکھا
سوداگر را چہ می باید
بوچے کو کیا چاہیے
تشنہ را چہ می باید
ملاپ کو کیا چاہیے
شکار بچہ می باید کرد
قوتِ مغز کو کیا چاہیے

موسیقی میں اُن کی طبیعت ایک ایسا ساز تھی جو کسی مضراب کی محتاج نہ تھی۔ امیر خسرو نے دھرپت کی جگہ قول وقلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کیے کہ ان میں سے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مرد اور عورت کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت راگ نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انھیں کی ایجاد ہے۔ موسیقی کے ذوق کے متعلق اُن کے چند لطیفے زبان زد خاص وعام ہیں۔ طوالت کی وجہ سے اُن کو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا تاہم ایک ہلکا سا اشارہ کافی ہوگا۔ ایک مرتبہ سلطان جی کے یہاں ایک مہمان آیا۔ کھانا کھا کر آدھی رات تک بیٹھا رہا اور اُٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ جب آدھی رات کی نوبت بجی تو سلطان جی نے خسرو سے پوچھا کہ خسرو یہ کیا بجا۔ بلا تکلف فرمایا۔

"نان کہ خوردی خانہ برو......
نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو

اسی طرح دھنیے کی دھنکی میں سے جو آواز نکلتی ہے اُس کو اس طرح ادا کیا ہے۔

"در پئے جانان جان ہم رفت
جان ہم رفت جان ہم رفت ....
..... رف رف رف رفتن وہ"

امیر خسرو صوفی ہونے کے علاوہ فارسی عربی اور ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندو اور

مسلمانوں کو ایک ایسی محبت کے رشتہ میں جکڑ دیا جائے کہ وہ رشتہ کبھی نہ ٹوٹے۔ ان کی یہ خواہش ان کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہے۔

چو من طوطی ہندم از راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم عرب

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری می کنم با خلق ما را کار نیست

الغرض امیر خسرو ہندو مسلم اتحاد کے ایک بہت بڑے حامی تھے اور اس غرض کے لیے انھوں نے ایک مشترک زبان بنا رکھی جسے عرف عام میں کھڑی بولی کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا کہ انھوں نے فارسی اور برج بھاشا کو نون مرچ کی طرح ملا دیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی غزل بھی ایجاد کی جس کی بحر بھی فارسی ہیں اور خیالات ہندی۔ اسی طرح ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمایئے جو اس اعتبار سے "آدھا تیتر آدھا بٹیر" ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہیں لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اسی طرح ایک محبوبہ کا [illegible] جو بال کھولے ہوئے پلنگ پر سو رہی ہے [illegible] اس کی سیاہ زلفوں نے اس کے چہرہ کو چھپا رکھا ہے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چوں دیس

امیر خسرو کا فارسی کلام کا باقاعدہ ایک دیوان موجود ہے۔ یہ پانچ حصوں میں ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر مدحیہ قصائد ہیں۔ (۱) تحفۃ الصغر (۲) وسط الحیوۃ (۳) غرۃ الکمال (۴) بقیہ نقیہ (۵) نہایۃ الکمال۔ یہ دیوان ادبی خوبیوں کے علاوہ تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہے کیونکہ ہر حصہ میں شاہانِ وقت کی تعریف کی گئی اور اسی طرح ان کے درباری اور ملکی حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے قصائد میں حضرت نظام الدین اولیائؒ سے لے کر بلبن اعظم کے بیٹے اور اپنے سرپرست نصرت الدین سلطان محمد اور سلطان معز الدین کیقباد۔ جلال الدین فیروز شاہ اور اس کے جانشین مثلاً رکن الدین اور علاء الدین وغیرہ۔ علاء الدین محمد شاہ۔ سلطان غیاث الدین تغلق تک کی تعریف کی گئی ہے اور اس طرح یہ قصائد ایک طویل عرصہ کی تاریخی معلومات کا معتبر ذریعہ ہیں۔ لیکن ان کی غزلیں قصائد سے کہیں [illegible]

[illegible] ان کی غزلوں میں اکثر عاشقانہ مضامین
[illegible] آرزوئے دیدار، ہجرانِ یار، رنگینِ
[illegible] شیخ وار، یار کرشمہ ساز، زلفِ کمند
[illegible] سیلِ اشک، خدنگِ نرگسِ مست،
[illegible] چوگان اور کبکِ خوش خرام کے موضوعات
[illegible] اگر کہیں زہد، خرقہ پوشان اور دیر درد نوشان کو
نمایاں کیا ہے تو کہیں چشمِ زیبا اور اس کے احوال
و اشکال فراواں کی خوب داد دی ہے۔ امیر خسرو
نے حکیم نظامی کی نقل میں پانچ مثنویاں بھی لکھی
ہیں (۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) مجنوں
لیلیٰ (۴) آئینۂ سکندری اور (۵) ہشت بہشت
ان کے علاوہ قرآن السعدین، نہ سپہر، مفتاح
الفتوح اور خزائن الفتوح بھی انھیں کی کاوش
کا نتیجہ ہیں۔ امیر خسرو کے اشعار کو از سرِ نو جمع کیا
جا رہا ہے اور آج کل خسرو اکیڈمی اس کام کو
بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ اس سلسلہ
میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر مرزا صاحب بڑی
جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی فارسی
غزلیات سے لطف اندوزی کے لیے صرف
دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا
گر اے زاہد دعائے خیر میگوئی مرا این گو
کہ آن آوارہ کوئے بتان آوارہ تر بادا

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
منم آہوئے رمیدہ ز خدنگِ خوبرویان
بہوس ہمیرم ار تو بشکار خواہی آمد

چہ بلاست از دو چشمت نظرِ نیاز کردن
مژہ را کشادہ دادن در فتنہ باز کردن
صفِ عاشقانست اینجا مدہ اے فقیہ زحمت
کہ بشہر بت پرستان نتوان نماز کردن

فی الجملہ امیر خسرو کو ہندوستان کا سب
سے بڑا ایرانی اور ہندی شاعر کہا جا سکتا ہے۔
ان کا امتیازی وصف کلام کی روانی اور چاشنی ہے
وہ نظم و سخن میں سرعتِ خیال اور جودتِ طبع کے
حامل تھے۔ خمسہ کے اشعار میں ایک خاص لحن
اور ایک مخصوص لطافت ہے وہ بعض الفاظ اور
تراکیب کے استعمال میں ایرانی شاعروں سے
دور ہو گئے ہیں اور ہندوستانی رنگ غالب ہے اور کیوں
نہ ہو ان کو ہندوستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے والہانہ
محبت تھی اگر اس محبت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی مثنوی
نہ سپہر پڑھیے لیکن ہر کمالے را زوالے، آسمانِ صوفیہ
کا یہ درخشاں ستارہ، شاہانِ وقت خواص و عام کا
قبلہ اور طوطیِ شکر مقال گلزارِ ادب میں چہچہا کر سنہ مطابق
سنہ ۱۳۲۴ء میں بمقام دہلی دیارِ آخرت میں جا پہونچا گو آج
امیر خسرو ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن اس کی یاد تازہ ۴۴

---

۴۴ کرنے کے لئے اب بھی بستی نظام الدین موجود ہے جہاں ہر سال ہزاروں عاشقان سلطان الشعرا کی مرقد مبارک پر فاتحہ خوانی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

ریاض احمد ۔ پانڈوہاٹ

حاتم اور اُن کی شاعری

شاہ حاتم دورِ اول کے شعرا سے تعلق رکھتے ہیں یہی خیال آزاد کا بھی تھا مگر بعد میں انھوں نے شاہ حاتم سے دوسرے دور کا آغاز کر دیا۔ شاہ حاتم نے غزل، قصیدہ، رباعیات، مثنویات سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی مرغوب ترین صنف غزل ہی ہے۔

شاہ حاتم کی شاعری پر گفتگو سے پہلے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول میں پیدا ہوئے، کن حالات کی آغوش میں تربیت پائی اور زندگی کے ابتدائی دور میں انھیں پے در پے کن تجربات سے سابقہ پڑا۔

نام و نسب: ان کا نام شیخ ظہور الدین ولد فتح الدین تھا۔ پہلے رمز اور بعد میں حاتم تخلص اختیار کیا۔ خاص شاہجہاں آباد (دہلی) کے رہنے والے تھے۔

دل نہاں پھرتا ہے حاتم نجف اشرف کے بیچ
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے

ان کے پہلے دیوان کے سرورق پر اصفہانی لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد اصفہان کے رہنے والے تھے۔

سال ولادت و وفات: حاتم کی پیدائش ۱۱۱۱ھ ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق "ظہور" ان کے تولد کی تاریخ ہے۔ لیکن سال ولادت پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے 'خمخانۂ جاوید' میں تاریخ وفات ۱۲۰۷ھ اور عمر ۹۶ سال لکھی ہے۔ مشہور مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا خیال بھی یہی ہے کہ ان کی تاریخ وفات ۱۲۰۷ھ ہی درست ہے لیکن مصحفی نے تذکرہ فارسی میں ۱۱۹۶ھ تاریخ وفات لکھی ہے۔ اور ۸۳ سال کی عمر بتلائی ہے زیادہ تر مورخ اور تذکرہ نویس ۱۲۰۷ھ کو ہی درست جانتے ہیں۔ دتاسی اور زور بھی اسی کو صاد کرتے ہیں۔

تعلیم و تربیت و پیشہ: اُن کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ شاعری تو ذریعہ عزت تھی اس پرآشوب اور غیر یقینی دور میں ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ اور اسمیں مصلحت اندیشی بھی تھی۔ جہاں تک تحصیل علم کا تعلق ہے حاتم نے بھی اسی طرح تعلیم حاصل کی جیسی کہ اُس زمانے کے شرفا حاصل کرتے تھے ان کی شاعری اور پیشہ کو دیکھتے ہوئے [WO]RDSWORTH اور SHELLEY دو انگریزی شاعروں کی طرف خیال جاتا ہے جو بیک وقت سپاہی و شاعر دونوں تھے جو ایک طرف تو میدان جنگ میں تلواروں کے ہاتھ

غالباً اسی بنا پر ... شاعری میں جاوداں بنانے
... حاتم ... عہد رکھتے ہیں۔

سیاسی و معاشرتی حالات:

جب شیخ ظہور الدین حاتم نے آنکھیں کھولیں تو ہندوستان کا بڑا پرآشوب دور تھا۔ مغلیہ سلطنت جس کا پرچم تا اختلاط سے راس کماری تک پھیلا ہوا تھا، اب اس کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد خانہ جنگی کا ایک دور شروع ہوتا ہے اس کی ابتدا جہاندار شاہ کی تخت نشینی سے ہوئی اور اس کی انتہا ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کے گرنے۔ شمس اس زمانے کے حالات، سرکار تنزل سلطنت میں اس طرح لکھتا ہے کہ "ہر طرف افراتفری تھی یہاں تک کہ امرا ایک دوسرے کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے قتل و خون کا ڈرامہ کھیلتے رہتے تھے۔" اس کے بعد ایک قہر اور نازل ہوا یعنی نادر شاہ درانی نے دلی پر حملہ کیا۔ اور قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم ہوا کہ صدیوں تک دلی اس کی گرمی نہ بھول سکی۔ احمد شاہ رنگیلے نے ۔ کروڑ روپیہ اور شاہ جہاں کا تختِ طاؤس، تاوان میں دے کر اس بلا سے چھٹکارا حاصل کیا۔ عبدالحئی تاباں کا شعر ہے۔

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس

اس زمانے کے بادشاہ عیش پرست، ناکارہ، کم عقل، اور کم فہم تھے۔ یہ سب امرا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے۔ طوائف الملوکی عروج پر تھی۔ چاروں طرف باغیانہ طاقتیں جاٹ، روہیلے، مرہٹے، سکھ، بس سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے درپے تھے۔ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے تو مغلیہ سلطنت کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ شہزادیوں، رانیوں وغیرہ کو دو، دو دن تک کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ حاتم لکھتے ہیں۔

جن کو ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں
پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
پارچہ نان کو رکھ ہاتھ پہ کھاتے ہیں اسیر
جس کو دیکھوں ہوں سو ہے فکر میں غلطاں پیچاں

جو امرا و رؤسا، ہاتھی گھوڑوں پر بیٹھ کر گھر سے نکلتے تھے وہ ننگے پاؤں ہو گئے۔ اور جن کے دسترخوان پر ... نعمتیں موجود ہوتی تھیں وہ خود ہاتھ پر روٹی رکھ کر کھانے لگے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد تاج و تخت کے لئے حسب معمول قتل و خون و غارت گری شروع ہو گئی۔ اور قسمت کا فیصلہ معظم کے حق میں ہوا وہ شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے مغلیہ تخت پر بیٹھا۔ ۵ سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک بار پھر خون کی ہولی کھیلی گئی اور اس ہولی میں لوگ اس قدر منہمک رہے کہ بادشاہ کی تجہیز و تکفین کا بھی کسی کو خیال نہ آیا۔ اور مرحوم کی لاش ایک ماہ تک بے گور و کفن ننگے فرش پر پڑی رہی۔

اب تخت جہاندار شاہ کے نیچے تھا۔ وہ نہایت عیاش تھا۔ اس کو لال کنور نامی ایک بازاری عورت سے عشق ہو گیا۔ ایک دن وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ

بازاری عورت خرید و فروخت کر کے لوٹ رہا تھا کہ راہ میں لال کنور کی سہیلی کا گھر پڑا۔ دونوں اس کے گھر چلے گئے وہ عورت تھی۔ دونوں نے تو بہ پی۔ واپسی پر بادشاہ نے اس عورت کو انعام و اکرام کے علاوہ ایک گاؤں بھی جاگیر میں عطا فرمایا تھا۔ لال کنور کو خادمائیں گود میں اٹھا کر لے گئیں۔ بادشاہ سلامت مدہوش تھے۔ رتھ والا بھی نشہ میں چور تھا وہ ان کو لے کر روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ سلامت کو تلاش کیا گیا تو وہ محلسرا سے دو میل دور، رتھ میں پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔

یہ بازاری عورت کے ساتھ گھومنے والا، بادشاہ، شہنشاہ عالمگیر کا پوتا جہاندار شاہ تھا۔

جہاندار شاہ سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سینکڑوں حادثات و واقعات تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہی وہ حادثات و واقعات ہیں جنھوں نے ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچادی۔ اور اب مغلیہ خاندان کا ایک نفس بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

حالاتِ زندگی: آزاد "آب حیات" میں لکھتے ہیں۔

"شاہ حاتم پہلے ہی سپاہی پیشہ تھے۔ عمدۃ الملک امیر خاں کی مصاحبت میں عزت اور فارغ البالی بلکہ عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے اور چونکہ وہ محمد شاہی دور تھا اس لئے آئین زمانہ کے بموجب جو جو اس وقت کے نوجوانوں کے شغل تھے سب پورے کرتے تھے۔"

مگر بعد قتل نواب صاحب ان کی زندگی مسلسل پریشانیوں اور فکر روزگار میں گزرنے لگی

محتاجگی سے مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

مفلسی اور دماغ دے حاتم
کیا قیامت کرے جو دولت ہو

گھر کیا ہے ہم نے حاتم بر سر دالیقا
جھاڑ میں ڈالیں گے لیکن منصب جاگیر ہم

فیض سے ہمت کے حاتم دل تونگر چاہئے
مفلسی سے ان دنوں گو ہاتھ مرا تنگ ہے

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، دہلی میں اس زمانے میں ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء، شعرا تو کیا بادشاہ تک محتاج ہو گئے تھے۔ کوئی کسی کا یار و مددگار نہ تھا۔ ایسی حالت میں حاتم نے زندگی سے فرار کی سوچی اور بادل علی شاہ کے تکیہ کی طرف رخ کیا۔ بادل علی شاہ کے انتقال کے بعد، حاتم شاہ تسلیم کے تکیہ میں پہنچ گئے۔ جو شخص ایک بار ان شاہوں کے گروہ میں داخل ہو جائے پھر وہاں سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں۔ شاہ صاحب کو خود شعر گوئی کا ذوق تھا۔ اور ان کے تکیہ میں شعرا کی نشست رہتی تھی۔ "آب حیات" میں لکھا ہے۔

"بانکوں کی طرح سر پر سرپیچ باندھے تھے۔ راجگھاٹ کے دستے میں قلمے

[illegible] درختوں کا سایہ
[illegible] پڑتا تھا یہاں تھا شاہ
[illegible] وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے اور
چند احباب اور شاگردوں کے ساتھ
شعر و سخن کا چرچا رکھتے تھے چنانچہ
۰۰ برس تک اس معمول کو نباہ
[illegible] گرمی، جاڑا، برسات، آندھی
جائے، مینہ جائے، وہاں کی نشست
قضا نہ ہوتی تھی "

امیر خسرو کی طرح شاہ حاتم نے بھی چھ سات بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا۔ عالمگیر، بہادر شاہ اول جہاندار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر ثانی سب ان کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ آخر ۱۲۰۷ھ ماہ رمضان میں اس سرائے فانی سے، عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا اور دلی دروازے کے باہر ہمیشہ کے لئے سو رہے۔

سے چاہے تھا کچھ کہے کہ اسی دم میں ناگہاں
یوں آ گئی اجل کہ رہی من کی من کے بیچ

شعر و شاعری: حاتم نے جس زمانے میں شاعری شروع کی، اُس زمانے میں دلی کی گلیوں میں " دیوانِ ولی " کی شہرت تھی۔ ہر شخص کی زبان پر ولی کے اشعار تھے۔ اور ان کا اندازِ بیان بے حد مقبول تھا۔ حاتم نے بھی ان کے تتبع میں اپنے پہلے کلام کا جائزہ لیا اور ایک نیا دیوان " دیوان زادہ " کے نام سے ترتیب دیا۔ ان کی شاعری کے متعلق جتنا کچھ مواد ملتا ہے وہ اسی " دیوان زادہ " کا دیباچہ ہے جس میں شاہ حاتم نے بتلایا ہے کہ انھوں نے شاعری میں کیا جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور زبان کو کس طرح صاف و شفاف بنایا ہے۔ اور کیا کیا الفاظ ترک کئے ہیں۔ یہ رضا لائبریری میں موجود ہے

اس دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے غیر شائستہ اور غیر مانوس الفاظ کو قلم زد کر دیا۔ اور ان کی جگہ سبک و سہل الفاظ استعمال کئے۔ انھوں نے عربی و فارسی اور ہندی و سنسکرت کے مشکل الفاظ سے پرہیز کیا اور ان کی جگہ عام فہم اور روزمرہ کی بول چال کے الفاظ استعمال کیے۔ یہاں چند مثالیں ایسی پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان کو نکھارنے میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

(ا) نین، نت، اور جگ وغیرہ الفاظ کا استعمال ترک کیا۔

(ب) الفاظ کا درست تلفظ۔ مثلاً تسبی کو تسبیح صحی کو صحیح، بگانہ کو بیگانہ، دوانے کو دیوانہ وغیرہ لکھا۔

(ت) غیر فصیح حروف یعنی الفاظ خارج کئے۔ جیسے در، بر، از، وغیرہ

اسی طرح گھوڑا دوڑا، دھڑ اور سر، اور کبھو وغیرہ۔

حاتم کا کل کلام سامنے نہیں ہے۔ صرف ایک " دیوان زادہ " ہے وہ بھی اردو کی بدقسمتی ہے کہ ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ جب تک کسی شاعر کا کل کلام سامنے نہ ہو اس کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا نامناسب ہی نہیں بلکہ ناانصافی کی حد تک پہنچ جاتا

ہے۔ اور اس کی بہترین مثال مصحفی کی پیش کی جا سکتی ہے۔

بہر کیف غزل کے تمام مضامین حاتم نے بخوبی باندھے ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری دکنی سے متاثر نظر آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے زبان میں سادگی، شگفتگی، شائستگی، پاکیزگی، سب ہی کچھ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزل اور معشوق اور اس کا حسن دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ حاتم کے معشوق کا حسن، چشم بد دور یکتا ہے اور ثانی اس کا کوئی نہیں۔ جب اس کے دانتوں میں مِسّی لگی ہو تو دن اور رات دست و گریبان نظر آتے ہیں دانت کیا ہوتے ہیں جیسے کسی نے موتیوں کا ہار بنا دیا۔ عارض سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ آنکھیں گلِ بادام ہیں اور اگر کہیں وہ پان کھائے تو لالہ کے پھول پیکدان پیش کرتے ہیں۔

شور اس حسن کا یک چند تو ہم سنتے تھے
چشم بد دور اب آنکھوں سے دو چنداں دیکھا

نظر آئے تیرے دنداں مسّی مالیدہ
رات اور دن کو ہم دست و گریباں دیکھا

مجھ کو درکار نہیں مشک و عنبر و صندل
میں ہوں دیوانہ پری رو کی چوٹی کی بُو کا

عارض سے اس کے زلف میں کیونکہ ہے روشنی
ظلمات میں تو نام نہیں آفتاب کا

دیکھ کر تیری چمن بیچ گلابی آنکھیں
باغباں نے گلِ بادام کے تئیں جام کیا

عشق و عاشقی کے جذبات [illegible] سے چھیڑ، معشوق کے ظلم، رقیب کی عیاری [illegible] دشت نوردی، گل و گلزار، گریۂ یار، شمع و پروانہ، گل و بلبل، سب کچھ ہی ان کی غزلوں میں مل جاتا ہے۔ فانی کا ایک شعر ہے۔

دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

اُسی مضمون کا حاتم کا شعر ہے سنیے۔

دل عشاق کو ایسا کیا ویراں ظالم
مدّت اب چاہیے اس شہر کو بستے بستے

خاطر میں تو لاتا نہیں تو چاہ کسی کی
ظالم تجھے لگ جائے کہیں آہ کسی کی

ابر میں یاد، یار آتے ہیں
گریہ، بے اختیار آتے ہیں

خلق نے مفت میں کیا بدنام
مجھ سے اُس کا نہ ہے دعا نہ سلام

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے
شوخ ہے ظالم ہے اور ستمگر ہے

کیونکر سب سے تجھے چھپا نہ رکھوں
جان ہے، دل ہے، دل کا اندر ہے

مارنے کو رقیب کے حاتم
شیر ہے، ببر ہے، غضنفر ہے

مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے منزل
بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا

جان سے بے درد کو جلا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا
نہیں شمع و چراغ کی حاجت
دل ہے مجھ بزم کا دیا میرا
زندگی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

تغزل کے علاوہ ان کے یہاں تصوف کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ ان کے حالات زندگی ہیں۔ انھوں نے مخمل و کمخواب کا تکیہ چھوڑ کر، شاہوں کا تکیہ اختیار کر لیا تھا۔ فقیروں کی صحبت تھی۔ شاہ تسلیم کے مرید تھے۔ راج گھاٹ کے میدان میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ چونکہ انہیں 'ہمہ اوست'، 'ہمہ از اوست'، کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی اس لیے معرفت میں اچھے اچھے مضامین نکالے ہیں

کسی ہندو، مسلماں نے خدا کو
نہ کعبہ میں نہ بت خانے میں دیکھا
نہ کوہستاں میں دیکھا کوہکن نے
نہ مجنوں نے ویرانے میں دیکھا
نہ اسکندر نے دیکھا آئینے میں
نہ جم نے اپنے پیمانے میں دیکھا
فقیروں سے سنا ہے ہم نے حاتم
مزہ جینے کا مر جانے میں دیکھا

افسوس شیخ دل سے تجھے راہ ہی نہیں
بہتر تو اس سے کوئی گذرگاہ ہی نہیں
تو ڈھونڈتا کہے ہے کک اپنی طرف تو دیکھ
جو کچھ ہے تجھ میں اس سے تو آگاہ ہی نہیں

میں اس طرح سے ہوں مہماں سرائے دنیا میں
کہ جس طرح سے کوئی دم حباب دریا میں
جہاں کے بحر میں ہر موج بوجھ سیل فنا
بنا نہ گھر تو بے خانہ خراب دریا میں

مسند بوسی سے اے زاہد نہیں شان فقر
بوریئے پر بیٹھیے اور بے ریائی کیجیے
کوہکن سے کیا ہوا پھوڑا اگر پتھر سے سر
کام یہ ہے کوہ غفلت رائی کائی کیجیے
چشم بینا دے خدا، تو چاہیے مانند چشم
اپنے گھر بیٹھے ہوئے سیر خدائی کیجیے

اپنی شاعری کے بارے میں خود حاتم یہ فرماتے ہیں

ع حاتم کا شور تیس برس سے ہے ہند میں
صاحبقراں ہے ریختہ گوئی کے فن کے بیچ

اٹھتیس برس ہوئے کہ حاتم
مشاق قدیم و کہنہ گو ہے

بڑا غضب ہے کہ حاتم کو تم نہ پہچانو
وہی قدیم تمھارا غلام، بھول گئے؟

شبیر احمد

مرزا مظہر جانجاناں

مرزا مظہر جانجاناں کئی لحاظ سے اردو شاعری میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ اصلاح زبان کے سلسلے میں ان کی کوششیں ہیں۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولی کے دہلی آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ولی سعد اللہ گلشن کے مشورے پر فارسی شعرا کے مضامین کی طرف متوجہ ہوئے اس کے باوجود ان کے کلام پر ہندی اثرات غالب رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ:۔

"سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذو معنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی...... اردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی"

لہذا ایہام کی صنعت گری ولی کے کلام پر چھائی ہوئی ہے۔

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

حاتم لہذا آبرو بھی ایہام گوئی میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حاتم کو اپنی اس لغزش کا اندازہ ہوگیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے منتخب کلام (دیوان زادہ) کے علاوہ باقی تمام کلام کو منسوخ قرار دیا لیکن جس نے سب سے پہلے اردو شاعری کو اس عیب سے نجات دلانے کی باقاعدہ کوشش کی وہ مرزا مظہر جانجاناں ہیں۔

مرزا مظہر کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ جب ہمایوں نے ایران کے بادشاہ طہماسپ کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لے لی تو مرزا کے دادا امیر بابا خاں اس کے ہمراہ ترکستان چھوڑ کر ہندوستان آئے۔ مرزا مظہر کے والد مرزا جان کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ یہ اورنگ زیب کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر مستعفی ہو گئے۔ ترکِ ملازمت کے وقت وہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں تھے۔ وہاں سے آگرہ آکر سکونت اختیار کر لی جانجاناں وہیں ۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ کو پیدا ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آئینِ سلطنت تھا کہ امرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں۔ بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کر دیں۔ کسی کو خود بھی بیٹا بیٹی کر لیتے تھے۔ یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے۔ ان کے لیے ایک وقت پر سندِ ترقی ہوتے تھے اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جانثاری کی امیدیں ہوتی تھیں۔"

چنانچہ ان کی ولادت کے بعد اورنگ زیب کو اطلاع دی گئی (گو اس وقت ان کے والد ملازمت ترک کر چکے تھے۔ اورنگ زیب نے کہا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ کا نام چونکہ میرزا جان ہے، اس لیے اس کا نام ہم نے جانِ جاں رکھا۔ بعد کو جانِ جاناں ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم آگرے میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ دہلی آ گئے اور جامع مسجد کے قریب ایک بالاخانے پر رہنے لگے۔ والد کی وفات سے قبل علوم ظاہری و باطنی میں کامل ہو چکے تھے والد کے انتقال کے بعد حصولِ ملازمت کے لیے بادشاہ فرخ سیر کے دربار میں حاضر ہوئے لیکن بادشاہ اس دن علالت کے سبب باہر تشریف نہ لائے۔ اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ کسی بزرگ نے اپنی ٹوپی ان کے سر پر رکھ دی ہے۔ اسی دن سے ملازمت کا خیال چھوڑ دیا اور کامل فقیروں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ تیس سال تک کسب فیض کرنے کے بعد خود مسندِ ارشاد و ہدایت پہ بیٹھے اور ہزاروں مریدوں کو فیض پہنچایا۔

شعر و شاعری سے شروع سے لگاؤ تھا لیکن جوں جوں فقر و درویشی کا رنگ چڑھتا گیا۔ شاعری کا رنگ اترتا گیا اور آخر عمر میں یہ دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ آزاد بلگرامی سروِ آزاد میں انھیں میر غلام نبی کا شاگرد لکھتے ہیں یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ خود مرزا مظہر کا بیان ہے کہ :۔

بحرف کس نہاند حرف من مظہر چو جبریلم
خدا بے واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کردہ

محرم کا مہینا تھا۔ مرزا صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ اپنے بالاخانے پر بیٹھے کہ ایک تعزیہ ادھر سے گزرا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ جس مقدمے کو بارہ سو برس ہو چکے ہوں ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت نہیں ہے؟ لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا عقل کی خفت ہے۔ یہ بات ان لوگوں نے جو تعزیے کے ساتھ تھے سنی اور امام باڑوں اور محفلوں میں دو تین شب اس کا چرچا ہوتا رہا۔ ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کی شب کو کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر تشریف لائے تو اس ظالم نے طمنچے سے وار کیا۔ مرزا زخمی ہو گئے۔ تیسرے روز وفات پائی۔ لوحِ مزار پر خود مرزا صاحب کا شعر کندہ کرایا گیا۔

بہ لوحِ تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وفات کے بعد دوستوں نے ان کا دیوان کھولا کہ جو شعر نکلے وہی مزار پر کندہ کرایا جائے۔ دیوان کھولا تو مندرجہ بالا شعر نکلا۔

شعر و شاعری

مرزا مظہر نے وہ زمانہ پایا جب شعر و شاعری ایہام کے ہاتھوں بگڑ رہی تھی لیکن ان کی دور بیں نظروں نے جلد ہی پہچان لیا کہ اگر یہ ڈھنگ باقی رہا تو اردو شاعری پستیوں کی انتہا کو جا پہنچے گی۔ چنانچہ انھوں نے ایہام سے اسے نجات دلائی۔ ان کے اشعار میں بلا کی سادگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری داخلیت اور دروں بینی کی شاعری ہے۔ پھر بھی ان کے کلام میں نشاطیہ عنصر موجود ہے اور وہ خارجی شاعری میں بھی کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:۔

حنا تیری کف پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ

بقول رضیہ سلطانہ مظہر کے کلام میں زندگی کا سارا تنوع موجود ہے وہ صرف انسان کی ناکامی اور عالم کی بے ثباتی ہی کو نہیں دیکھتے۔ زندگی کو برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں شوق و وصال کی تصویریں بھی ملتی ہیں اور ہجر و فراق کے افسانے بھی۔ انھوں نے اپنے دور کی مخصوص سماجی روایات کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی ہے اور الفاظ کی رعایتوں سے بھی کام لیا ہے۔ مگر دور از کار صنعتوں سے مضمون آفرینی کی کوشش نہیں کی۔ ان کی خارجی شاعری کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کی بناوٹی شاعری کی مشق ہوتی جس کا تعلق بعد کو خصوصیت کے ساتھ دبستان لکھنؤ سے ہو جاتا ہے تو آج ہماری زبان بڑھی ہوئی داخلی اور خارجی مضامین سے عہدہ برآ ہو سکتی البتہ اس بناوٹ اور تصنع میں بھی مظہر نے رفعت فکر و خیال کو ملحوظ رکھا ہے۔ تشبیہ و استعارے اگرچہ سادہ اور بے رنگ ہیں اور بادی النظر میں محض خارجی عالم سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں اور داخلی امور و محرکات سے ان کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر لفظی و معنوی صنعتوں کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ہر تشبیہ اور استعارہ رواجی طور پر ان کے یہاں نہیں آگیا بلکہ ان کے اپنے ذہن کا اختراع ہے ان کے اشعار میں جو توانائی اور تاثیر آئی ہے۔ وہ ان کی رعنائی تخیل اور خلوص کی آنچ سے پیدا ہوئی ہے۔ ان میں خیال کی مصوری اور ترجمانی کی صفت موجود ہے۔

عریانی و ابتذال اور حیا سوزی سے بچ کر ادا نگاری کرنا شاعری کی دشوار ترین منزل

ہے۔ قدم قدم پر لغزش کا احتمال ہے۔ مظہر نے اس مرحلے میں بھی فن کاری کا حق ادا کیا ہے ان کے اس قبیل کے اشعار پڑھ کر روحانی لذت کے سوا کسی قسم کا نفسانی اشتعال نہیں ہوتا مظہر کا سارا کلام دیکھ جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ کی لطافت و عظمت کے ساتھ زبان و بیان کی عفت و پاکیزگی کتنی ضروری ہے۔

ہماری شاعری میں ان کی روایت قائم کرنے میں مظہر کا بڑا حصہ ہے وہ جو باتیں کہتے ہیں وہ بہت جامع ہمہ گیر اور عام ہوتی ہیں۔ لیکن عامیانہ نہیں ہوتیں۔ ان کی زبان میں ایک پرکیف سادگی ہے اور بیان میں بے ساختگی۔

مظہر کے متعلق صاحبِ آبِ حیات لکھتے ہیں "اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرتِ کلام کے لحاظ سے میر اور سودا کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے لیکن چونکہ صانع قدرت نے طبیعت کی لطافت اور اصلی نفاست اور ہر بات میں انداز کی خوبی اور خوبصورتی ان کے مزاج میں رکھی تھی اور زمانہ بھی سب کا ایک تھا۔ اس کے علاوہ پرانے تذکرہ نویس لکھتے ہیں اور بزرگوں کی زبان سے یہی سنا ہے کہ زبان کی اصلاح اور اندازِ سخن اور طرز کے ایجاد میں انھیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا و میر کو"۔

....مظہر متقدمین میں شمار ہوتے ہیں اور میر و سودا ان کے بعد کے آنے والوں میں ہیں اس لیے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مظہر نے اردو شاعری کی وہ زمین ہموار کی جس کی روشوں پر بعد کو آنے والے شاعروں نے طرح طرح کے گل بوٹے کھلائے۔ انھوں نے اہلِ زبان کو غزل کا وہ نمونہ تراش کر دیا جس سے ایہام گوئی کا راستہ زمین شعر سے مٹ گیا۔ دوسری طرف غزل کے مزاج کو بدلنے کی امکان بھر کوشش کی۔ وہ انداز اختیار کیا کہ دوسرے فن کار مان گئے کہ تقاضائے وقت یہی ہے۔ میر جیسے خدائے سخن کا یہ کہنا تعلّی نہیں بلکہ زمانے کے مسکت جواب ہے اور مظہر کے خواب کی تعبیر:-

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مظہر کا طرزِ کلام کچھ ایسا ہے کہ اس کا مزید تجزیہ کرنا مشکل ہے۔ ان خصوصیات کو نہ گنایا جا سکتا ہے نہ بیان کیا جا سکتا ہے جن کی بدولت ان کے اشعار میں جادو جگاتے ہیں۔ اس دور غزل گوئی میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر چلنا آسان کام نہ تھا اور کچھ نہیں تو قبولِ عام کی سند سے محرومی تھی مگر وہ عاشق مزاج صوفی اس سے بیگانہ وار گزر گیا۔ اس میں ان کے مزاج کو بڑا دخل ہے۔ حسنِ صورت لطفِ معنی کا جو عشق ابتدا سے ان کی طبیعت میں راسخ تھا وہ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا اور ایک نئے انداز کی غزل میں جلوہ گر ہو کر رہا۔

بناکردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس سے ان کی طبیعت کی افتاد اور جمالیاتی حس کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ رنگِ تغزل جو ان کی اردو شاعری میں بھی جاری وساری ہے اور ان کو اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں سے الگ کرکے پیش کرتا ہے۔ ان کے دور میں غزل کو "با معشوق سخن گفتن" کے حدود سے آگے لے جانا گویا روحِ غزل کو مجروح کرنا تھا۔ ادھر صنائع بدائع ہی کو حاصلِ شاعری سمجھتے تھے۔ مظہر نے اس سے ہٹ کر اپنے تاثر یا ذہنی نقش یا خیال کو بڑی صداقت اور بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ گداختگی ان کی شاعری کی عین فطرت ہے خلوص اور بے تکلفی اور اسلوب اظہار کی دل پذیری اس پر مستزاد۔

گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
مرا جلتا ہے دل اس بلبلِ بےکس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بےکس افسوس
کیا ہوا اس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

وقت ہے ماہ رو کے آنے کا
فکر کر شمع کے بجھانے کا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

گل کو تو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں
دُر کو دُر کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں
مدت سے اس خیال کے آیا ہوں پیچ میں
گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں ہم کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

گزر گئے جو یہاں اور دنیا سے اٹھ پر .
ترا گھر اللہ کسی منزل رہا ہے

غنیمت جان قاتل جان مظہر
یہ مقتولوں میں تک بسمل رہا ہے

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

جواں مارا گیا خوباں کے بدلے میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا جس طرح تھا خوب کام آیا

ارے میاں لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے کس طرح ہے اور کدھر ہے

ہم نے سخن سنا تھا اس شوخ کے دہاں ہے
لیکن کہیں نہ دیکھا کیسا ہے اور کہاں ہے

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر انھیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

بقیہ دہلویت کا مفہوم

صفحہ ۱۲ کا

کی طرف خاص توجہ دی اور انداز بیان کو سنوارا انگریزی شاعر اور ناقد Colridge نے شاعری کو "best words in the best order" کہا ہے کیٹس اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ خوبصورت الفاظ اور خوبصورت فقروں کو ایک پرستار کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ شاعری عظیم نہیں ہو سکتی جس میں مواد اور ہیئت دونوں کو اہمیت نہ دی گئی ہو۔ آتش نے شاعری کی کیا خوب تعریف کی ہے:-

کھینچ دیتا ہے شبیہ شعر کا خاکا خیال
فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

غالب دہلی کے مضمون اور لکھنو کی زبان کے معترف تھے اور اردو شاعری معراج پر اسی وقت پہنچ سکی جب دونوں کا سنگم ہوا۔ اس لیے لکھنو اسکول دہلی اسکول اردو شاعری کی دو آنکھیں ہیں دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

محمد شعیب - دہم سی

میر تقی میر

فارسی کے کسی شاعر نے ایک رباعی کہی :-

در شعر سہ کس پیمبر انند
ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
خاقانی و انوری و سعدی

کسی نے سوال کیا "اور حافظ ؟"
جواب ملا "وہ تو خدائے سخن تھا"
بالکل یہی بات اردو شاعری میں میر پر صادق آتی ہے۔

اردو کے تقریباً سبھی شاعروں نے میر کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں۔ مصحفی کہتے ہیں :-

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منہ پر

غالب نے کہا ہے :-

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

حسرت نے ان الفاظ میں اظہار عقیدت کیا ہے :-

شعر میری نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

میر کے شاعرانہ کلام کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ سنیے - ایک بار مفتی صدر الدین آزردہ کے مکان پر ان کے احباب جمع تھے۔ مفتی صاحب نے کہا آیئے میر کے اس شعر پر شعر کہیں۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

سب قلم دوات لے کر بیٹھ گئے - اتنے میں ان کے ایک اور دوست آ گئے اور پوچھا -

"کیا ہو رہا ہے ؟"

انھوں نے برجستہ جواب دیا

"قل ہو اللہ کا جواب لکھا جا رہا ہے"

میر تقی کی پرورش ایک درویشانہ ماحول میں ہوئی - ان کے والد ایک خدا ترس صوفی بزرگ تھے لیکن بچپن کے زیادہ ایام ان کے منہ بولے چچا امان اللہ کی گود میں گزرے - ان کے ہمراہی میں بہت سے صوفیوں کی درگاہوں میں حاضری کا موقع ملا - ان صحبتوں کا نتیجہ نکلا کہ فقر و استغنا میر کا جزو حیات بن گئے۔ کم عمری میں والد کے سایے سے محروم ہو گئے۔ ترکے پر ان کے بڑے

[illegible] سے کچھ عرصہ کچھ کتابیں [illegible] کا ذکر آتا ہے ایسے [illegible] تھے جن کے پیروں کی خاک [illegible] آنکھوں میں لگاتے تھے۔ ان کے سلسلے [illegible] اب کوئی نہ تھا جو ان کے سر پر محبت کا ہاتھ رکھتا۔ کہتے ہیں :-

[illegible] سر ہوا اپنے وبال سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

بے یار و مددگار وطن (آگرہ) سے نکل کر دہلی پہنچے اپنے ماموں خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے اور ان سے بہت کچھ سیکھا جس کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ میر کا بیان ہے کہ ان کے بھائی نے لکھا کہ میر فتنۂ روزگار ہے اس کی پرورش میں ہرگز دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔ اس مشورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار ماموں نہ صرف یہ کہ ان کی پرورش سے دست کش ہو گئے بلکہ ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔

ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ خان آرزو کی بیزاری کا سبب ایک معاشقہ تھا۔ احمد حسین سحر مصنف تذکرہ بہار بے خزاں کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ لڑکی خان آرزو کی بیٹی یا ان کی کوئی عزیزہ ہو اور وہی اس تلخی کا سبب بنی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مثنوی خواب و خیال اسی دردناک اور ناکام معاشقے کی صدائے بازگشت ہو۔ یہ واقعہ ان دنوں کا معلوم ہوتا ہے جب میر خللِ دماغ کا شکار ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ عالم تھا کہ انھیں چاند میں کوئی شبیہ نظر آتی تھی جو چاند سے ان کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ان سے ہم کلام ہوتی تھی۔

میر کی زندگی کا یہ حصہ بڑی حسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔ یہ بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیا تھا۔ میر نے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا ان کی
انھوں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

ان کی خود نوشت سوانح ذکر میر اس دور کی چشم دید کہانی ہے۔ میر کے کلام کو دلی کا مرثیہ کہا جائے تو بجا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں :-

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

جب دہلی میں معاش ناممکن ہو گئی تو یہاں سے نکل کر پورب پہنچے۔ وہاں ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ کسی نے نہ پہچانا بلکہ ان کی عجیب و غریب ہیئت کا مذاق اڑایا۔ آخر ان کے سامنے بھی شمع آئی۔ لوگوں نے نام پتہ پوچھا انھوں نے حسب حال چند شعر فی البدیہ کہہ کر داخل کیے :-

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اس واقعہ کی صداقت مشکوک ہے کیونکہ دوسرا
شعر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ مصحفی کے دیوان میں موجود
ہے :-

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

میر کو دلی چھوٹنے کا ہمیشہ غم رہا۔ ایک مسلسل
غزل میں دلی کی یاد اپنے جلوے دکھا رہی ہے۔ طوالت
کے خوف سے صرف پہلے دو شعروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اے صبا! گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

اور چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں اے کاش مر رہتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

امکان تھا کہ یہاں ان کی قدر و منزلت ہوتی
مگر ان کی بدمزاجی اور کم دماغی آڑے آگئی وہ چاہتے
تھے کہ نواب بھی ان سے برابری کا سلوک کریں اور سچ
تو یہ ہے کہ نواب صاحب نے ان کی ناز برداری میں
کوئی کسر بھی نہ اٹھا رکھی مگر پھر بھی انھیں خاطر میں نہ
لاتے تھے۔ غرض گوشہ نشین ہو گئے اور قناعت اور
توکل کے سہارے زندگی بسر کر دی۔ مسعود حسین رضوی
نے تنقیدِ آبِ حیات میں اس رائے کا اظہار کیا ہے
کہ میر کی بددماغی کے واقعات محمد حسین آزاد
کی اختراعات ہیں۔ اگر ان کے بیان کیے ہوئے واقعات
کو من گھڑت فرض کر لیا جائے تو بھی خود ان کے کلام
سے اس بات کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ وہ بہت
نازک مزاج تھے۔ خود کہتے تھے۔

سینہ تمام داغ ہے سارا جگر ہے داغ
دل سوزشِ دروں سے جلتا ہے جوں چراغ
ہے مجلسوں میں نام مرا میر بے دماغ
ازبس کہ بددماغی نے پایا ہے اشتہار

میر کو اپنی برتری اور شاعرانہ صلاحیتوں سے
واقف تھے اور دوسرے شعرا کو کبھی خاطر میں نہ لاتے
تھے۔ نہ کسی کے کلام کی داد دیتے تھے ایک بار مصحفی
نے غزل پڑھی :-

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی جی کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی جی کو

جب اس شعر پر پہنچے :-

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ وہاں زلفِ دوتا لے گئی جی کو

تو میر نے سر اٹھا کر کہا "میاں صاحبزادے!
ذرا یہ شعر پھر پڑھنا" میر کی یہ داد کچھ ضرورت سے
زیادہ ہی تھی۔ مصحفی کھڑے ہو کر بجا لائے۔ انھوں نے
کہا "اس شعر کو سرِ دیوان لکھوں گا اور لکھ دوں گا کہ
میر صاحب نے یہ شعر دوبارہ پڑھوایا تھا۔"
میر کے والد بچپن ہی سے ان سے کہا کرتے تھے

[illegible] عشق ہی زندگی ہے عشق ہی مقصد
[illegible] ان کے چہرے کی زردی کو دیکھ کر
[illegible] یہ کیسی آگ ہے جو تیرے سینے میں دہک
رہی ہے۔ یہ زردی آخیر وقت تک نہ جا سکی۔
کہتے ہیں:-

کچھ مزاجِ دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی مرے رخسار سے جاتی نہیں اب تک

میر صاحب جن حالات سے گزرے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے کلام میں درد و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

زبان کے معاملے میں میر کی نظر گہری اور وسیع تھی۔ وہ کھرے کھوٹے کو خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے اپنا تعلق جامع مسجد کی سیڑھیوں، عوام کے جلسوں اور زندگی کی معمولی چیزوں سے کبھی قطع نہیں کیا۔ وہ زبان نہایت سادہ اور سلیس استعمال کرتے وہ فارسی کی اندھی تقلید کو قطعی پسند نہیں کرتے۔ ان کے کلام میں دیوار کے سائے میں سونے، راہ کے کانٹے مکڑی کے جالے، بجھے ہوئے دیئے، لٹے ہوئے نگر اور اس قسم کی حالتوں اور چیزوں کا اکثر ملتا ہے۔ انھوں نے غزل میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور جو محسوس کیا وہی لکھا ہے:-

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

وہ مضمون کی تلاش، چشم بینا اور دل بیدار کی مدد سے کرتے ہیں لیکن جب مل جاتا ہے تو اسے بڑی صفائی اور سادگی سے ادا کرتے۔ وہ جذبات کی نقل نہیں اتارتے بلکہ اندرونی تپش، سوز و گداز، اعلیٰ ترین تصوریت اور سخت ترین محنت سے شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیتے۔

بقول خواجہ احمد فاروقی صاحب کہ:-

"ان کے کلام میں درد کی لَو اور انسانیت کی شبنم، سادگی، راستی، معصومیت خلوص اور شدتِ اثر ہے وہ یوں ہی نہیں آئی، خونِ جگر سے آئی ہے، میر جن کیفیات کو بیان کرتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے گزر چکے ہیں۔ انھیں صحیح الفاظ انتخاب کا بڑا سلیقہ ہے"

شبلی فرماتے ہیں کہ:-

"میر اجزائے کلام کی ترتیب کو قائم رکھتے ہیں اور یہ ان کی قادر الکلامی کا بہت بڑا ثبوت ہے"

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

تھا میر بڑا صابر و شاکر
ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ کی

جس طرح غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنایا
ہے اسی طرح میر نے اپنی غزل کو اس طرح پیش کیا ہے
جیسے وہ کسی سے مخاطب ہوں۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کر

واعظ ناکس کی باتوں پہ کوئی جاتا ہے میر
آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

ان کے کلام میں طنز یہ لب و لہجہ ہے۔ ان
کے طنز میں دھیما پن ہے میٹھی میٹھی ٹیس ہے۔ وہ
تشبیہیں اور استعارے کم استعمال کرتے ہیں ان کی
تشبیہیں اور استعارے سادہ ہیں لیکن ان میں بلا کا
ایمائی اثر پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تجربہ
یا مشاہدے سے اخذ کی گئی ہیں۔

دورِ ولی	دورِ میر
جنوں آگے	جنوں کے آگے
نمن	طرح
ساجن	معشوق
نغمہ بولنا	نغمہ کرنا
سرج	سورج
جھلکار	جھلک
جن کن اچھے ہے	جن کے پاس ہے
آرسی	آئینہ
تن من	جان و دل
انجھو	آنسو

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکیں کے لیے گھر سے تو باہر نکلا

ہیں گو کہ سبھی تمھاری پیاری باتیں
پر جی سے نہ جائیں گی تمھاری باتیں
آنکھیں ہیں ادھر ہوئے سخن اور طرف
یاروں کی نظر میں ہیں تمھاری باتیں

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
ہزار جائے گئی طبع بد گماں میری

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی
حالِ بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

لطف پر اس کے، ہم نشیں! مت جا
کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

زخم جیسے داغ بھی کھائے بہت
دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
دیر سے سوئے حرم آیا نہ ٹک
ہم مزاج اپنا ادھر لائے بہت
پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمہیں بھائے بہت

باقی صفحہ [illegible] پر

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا رفیع سودا نے دہلی کا وہ زمانہ دیکھا تھا جس میں قتل وغارت گری اور بربادی و تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تصنیف "مرزا محمد رفیع سودا" میں ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں جس سے اس زمانے کی دلی کا نقشا ہمارے سامنے آجاتا ہے :-

باغ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس وخار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدم سرد و بصد حسرت و صد سوز جگر
دیکھ کر سوے چمن کہتی ہے با نالۂ زار

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

آباو اجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ دہلی سے باہر نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شجاع الدولہ نے لکھنؤ بلایا تو یہ رباعی لکھ بھیجی -

سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

حاتم سے تلمذ تھا۔ ایسا لائق شاگرد پانے پر استاد ساری زندگی فخر کرتے رہے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی نے شہرت سنی تو کمال اشتیاق سے بلایا۔ اور اصلاح لینے لگے۔

غضب کے حاضر جواب تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کی حاضر جوابی سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک دن بادشاہ نے دریافت کیا "مرزا کتے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟" انھوں نے کہا "جب طبیعت حاضر ہوتی ہے تو چند شعر کہہ لیتا ہوں"۔ بادشاہ نے کہا "ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں"۔

مرزا نے برجستہ جواب دیا "حضور! ویسی ہی بو بھی آتی ہے"۔

یہ کہہ کر چلے آئے اور پھر نہ گئے۔ بادشاہ نے بار بار بلایا اور کہلایا ہماری غزلوں پر اصلاح دو

ہم تمہیں "ملک الشعرا" بنا دیں گے انھوں نے بھی کہلا بھیجا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے کرنے کو تو میرا کلام مجھے ملک الشعرا کرے گا۔ شاگرد اور قدر شناس ایسی قدر کرتے تھے کہ آرام سے گزر گئی۔

جب دہلی میں بود و باش مشکل ہو گئی تو ناچار یہ بھی کنجِ قناعت سے نکلے۔ پہلے فرخ آباد میں نواب بنگش خاں سے متوسل ہوئے پھر لکھنؤ پہنچ کر شجاع الدولہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ شجاع الدولہ کو مرزا کا بلانا اور انکار کرنا یاد تھا۔ انھوں نے طنزاً کہا، مرزا تمہاری وہ رباعی جو تم نے لکھ بھیجی تھی اب تک دل پر نقش ہے" انھیں ایسا ناگوار گزرا کہ پھر دربار میں نہ گئے۔

قصیدے کی طرح مرزا ہجو کے بھی بادشاہ تھے۔ جس کی مدح کی اسے ہم دوش عقدِ ثریا کر دیا جس سے بگڑی، ہجو میں اس کی ایسی بخیہ ادھیڑی کہ تحت الثریٰ میں دھانس کر دم لیا۔ آزاد رقم طراز ہیں کہ :-

> غنچہ نام ان کا ایک غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ساتھ قلمدان لیے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے "ارے غنچے! لا تو قلمدان ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتے تھے کہ [illegible] بھی دہائی مانگے ..... غالب بیان: فقیر، امیر، نیک، بد کسی کی داڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔

طبیعت میں بلا کا جوش و خروش اور مزاج میں غضب کی رنگینی تھی۔ قادر الکلام ایسے تھے کہ ہر رنگ میں شعر کہنے پر قادر تھے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ ان کی صلاحیتیں قصیدہ گوئی تک ہی محدود ہیں، اس کے جواب میں کہتے ہیں :-

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

اصلاحِ زبان کے سلسلے میں مرزا کی کوششیں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے زبان کو روانی عطا کی۔ جہاں غیر مانوس ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں انھیں بھی ایسی خوبی سے کھپایا ہے کہ ناگوار نہیں ہوتے جیسے :-

سحر صولت کے سامنے تیرے
سامری بھول جائے اپنی پڑھنت
دیکھ میداں میں اس کو روزِ نبرد
منہ پہ راون کے بھول جائے لپھنت

نمونۂ کلام :-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کیونکر [illegible] بیاں کروں
[illegible] تیری زلف کو ہیں وحشت خانے میں
زنجیر [illegible] سے کماں کو دیکھ
نقش [illegible] نہیں کچھ اس کے غلنے میں
[illegible] تو چشم طمع کو کھول
قصے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانے میں
بچے میں کھینچ لیا قد کو جوں کماں
تیر مراد پر نہ بٹھایا نشانے میں
پایا [illegible] بات میں اپنے میں یوں تجھے
معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں
دست نگر کفا کو نہ تزئیں کرے فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی میں انگشت شانے میں
ہم سا تجھے تو ایک، ہیں تجھ سے ہیں کئی
جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

قصیدہ نگاری

اردو میں صرف دو قصیدہ نگار گزرے ہیں جنھوں نے اردو قصیدے کو عربی اور فارسی کا قصیدے کا ہم پلہ بنا دیا اور وہ ہیں سودا اور ذوق۔ ذوق کا زمانہ وہ ہے جب اردو زبان ترقی کر کے اس قابل بن گئی ہے۔ کہ اس میں خیالات کا اظہار زیادہ آسانی سے ممکن ہے اس کے باوجود ذوق کے قصائد میں نہ وہ تنوع ہے اور نہ وہ پر شکوہ انداز بیان جو سودا کا طرۂ امتیاز ہے۔ جوش بیان، پرشکوہ الفاظ کا انتخاب۔ ندرتِ بیان اور دریا کی سی روانی یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر قصیدہ قصیدہ کہلانے کا مستحق نہیں اور یہ سب خصوصیات سودا کو میسر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چیز جو سودا کو ان کے تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے ان کی خارجیت۔ خارجیت کے بغیر قصیدے کا تصور ممکن نہیں۔ سودا کے تمام ہم عصر دروں بینی میں گم نظر آتے ہیں۔ میر اور درد دونوں اپنے دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے اور ماحول سے بڑی حد تک بیزار اور بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری داخلی شاعری ہے۔

بیشتر تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے سودا کو سب سے بڑا قصیدہ گو تسلیم کیا ہے اور انھیں عرفی و انوری و خاقانی کا ہم پلہ ٹھہرایا ہے بلکہ مولانا محمد حسین آزاد نے تو سودا کو فارسی قصیدہ نگاروں پر ترجیح دی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اول تو قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں در عناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور و شور انوری اور خاقانی کو دبا جاتا ہے اور نزاکتِ مضمون میں عرفی و ظہوری

کو شرما تا ہے۔

آبِ حیات ص ۱۵۲، ۱۵۳

مندرجہ بالا اقتباس نقل کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:-

"یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ سودا نے فارسی قصیدہ گو شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سودا اردو قصیدہ نگاروں کے امام ہیں۔"

سودا نے قصیدے کے تمام اجزا پر یکساں توجہ کی ہے۔ ذیل میں ان اجزا کے جستہ جستہ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

عام طور پر قصیدہ نگار کوشش کرتا ہے کہ مطلع اتنا زوردار ہو کہ قاری یا سامع کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مبذول کرے۔ قصائدِ سودا کے چند مطلعے ملاحظہ ہوں:-

سباحِ عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام
حلال دخترِ رز بے نکاح و روزہ حرام

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی

چہرۂ مہر وش ہے ایک دستہ سنبلِ مشک فام دو
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

تشبیب | قصیدے کی تمہید کو تشبیب [illegible] چونکہ اس کے مضامین میں [illegible] ہوتا ہے اس لیے یہاں شاعر کو اپنی [illegible] قادر الکلامی کے اظہار کا اچھا موقع ملتا ہے۔ سودا نے تشبیب میں بڑے کمالات دکھائے ہیں۔ کہیں بہاریہ مضامین ہیں تو کہیں شاعرانہ تعلّی کہیں پند و موعظت کا دفتر کھول دیا ہے۔ ایک مثال [illegible]

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم حسنِ عمل
واسطے خلوتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع گی کرے روشِ پر مخمل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بارے آبِ رواں عکس ہجومِ گل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بس کہ ہوا ہے بیکل

ایک قصیدے کی تشبیب میں شاعروں کو یوں مشورہ دیتے ہیں۔

اوّلاً یہ کہ مجالس میں زباں والوں کی
تیرے آگے جو پڑھے کوئی سخنور اشعار
سخن ایسا نہ ہو سرزد کہ ہو دل اس کا ندیم
گو ہوا تیغِ زباں کا ترا جوہر اشعار
شعرِ تحسین پہ بھی ناداں کی نہ پڑھیو اک بار
پڑھیو دانا کی تو تقریر پہ مکرر اشعار
نہیں آفاق میں دلکش سخنِ بے تاثیر
گر اثر ہو تو کریں دل کو مسخر اشعار
[illegible]



ترکی ٹوپی میں: شیخ حاجی عبدالسلام صاحب بی۔ اے (مرحوم)

نصف چہرہ نظر آتا ہے: حاجی محمد رفیع صاحب چھابڑہ۔

کیمرہ کی جانب دیکھتے ہوئے: خان صاحب خان بہادر شیخ حاجی حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی۔

گول ٹوپی میں: حاجی محمدؐ صدیق صاحب بٹلہ۔

ترکی ٹوپی میں: شیخ محمد عمر لیس والے۔ جنرل سکریٹری انجمن وکیل قوم پنجابیان دہلی۔

ترکی ٹوپی اور سیاہ شیروانی: پرنسپل صاحب پنجابی اسکول۔

کیمرہ کی طرف دیکھتے ہوئے: ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات۔

پشت نظر آتی ہے: خان بہادر صاحب رشید احمد صاحب (مرحوم)

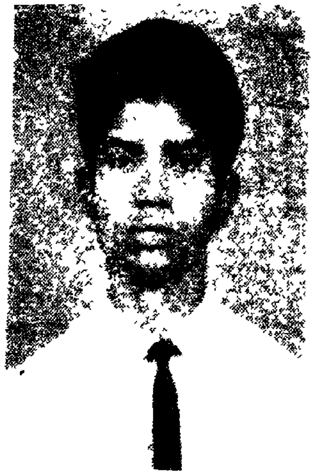
ترکی ٹوپی اور سیاہ شیروانی: صوفی صغیر حسن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی سابق پرنسپل صاحب فتحپوری مسلم ہایر سیکنڈری اسکول دہلی۔

کیمرہ کی جانب پشت ہے: حاجی محمد صدیق صاحب چاندنہ۔

مقام: پنجابی اسلامیہ ہایر سیکنڈری اسکول بلڈنگ۔ قطب روڈ۔ دہلی۔



مبارک اللہ خاں (اسکول برسر)



محمد غوث (دہم)
جنھوں نے دہلی اور بیرون دہلی کے تقریری مقابلوں میں بہت سے انعامات حاصل کیے۔



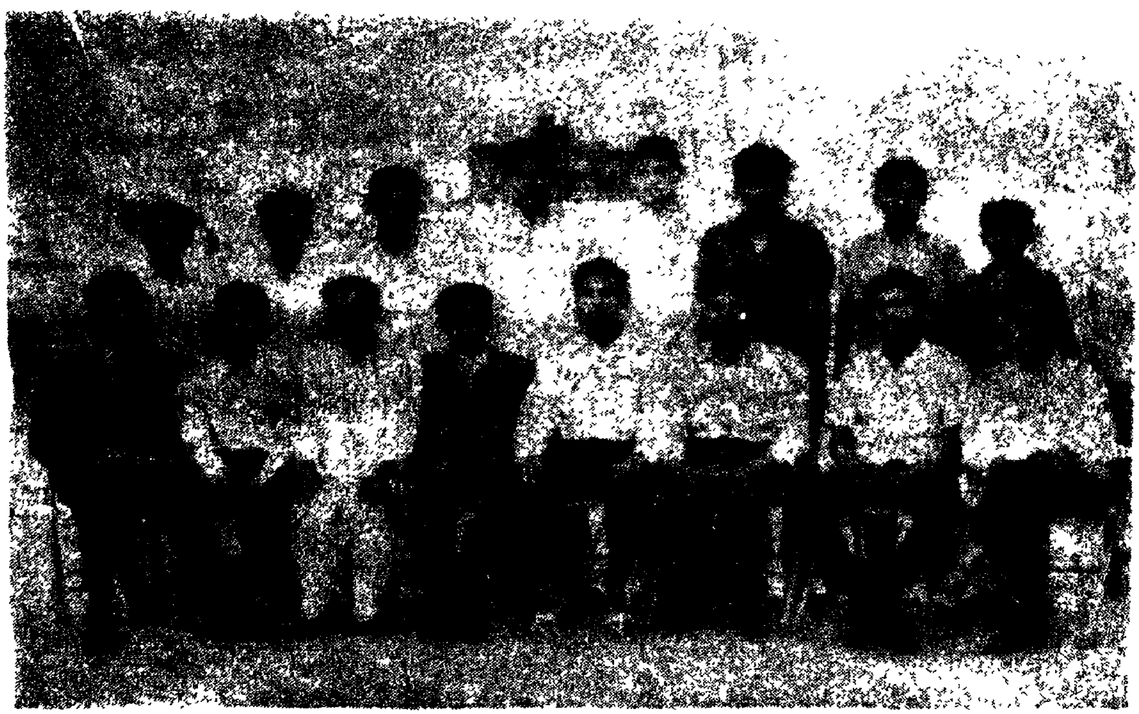
جناب عبدالرشید صاحب
پروپرائٹر، رایل پینٹ ہاؤس، فتحپوری (ہمدرد اسکول)



محمود سلطان (ہشتم)
جنھوں نے سیرت النبی امروہہ کے آل انڈیا تقریری مقابلے میں اول انعام لے کر شیلڈ اور کپ حاصل کیا۔



کامرس سوسائٹی کلاس دہم و یازدہم (1968-69)



کامرس سوسائٹی کلاس نہم (1968-69)



این۔ سی۔ سی۔ ٹروپ ۱۹۶۸—۶۹

از حفیظ عباسی

خواجہ احسن اللہ بیانؔ

خواجہ احسن اللہ (بعض تذکروں میں خاں کا بھی اضافہ ہے) نام۔ اور بیانؔ تخلص۔

بیانؔ کی سنِ پیدائش ابھی تک درست معلوم نہیں ہوسکی مگر اُن کی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ (چمنستانِ شعرا، ص۵۲ شورش ص۵۳) اور اُن کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ (مجموعہ نغز)

بیانؔ مولانا فخرالدین دہلوی کے مرید تھے اور میرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد۔ وہ اپنے اُستاد سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اور انہوں نے غزلیات میں اپنے استاد کو جگہ جگہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور فخر کیا ہے کہ وہ استادِ زمانہ کے شاگرد ہیں۔ ؎

جب سے شاگرد ہوا حضرت مظہرؔ کا بیاںؔ
کیا شاگردی کا اقرار سب استادوں نے

جب مرزا صاحب کا قتل ہوا تو ان کی تاریخِ وفات اس طرح نکالی۔ ع

صہبا شہ خوشہ کہ در خم جوشید — دریا شہ قطرہ کہ در بحر رسید
چوں دار بقا جناب مظہرؔ بپر ید — تاریخِ وصال مظہر گل گردید
۱۱۹۵ھ

شورشؔ نے لکھا ہے کہ "وہ خوبصورت اور خوب سیرت" دونوں تھے۔ شفیقؔ "چمنستان شعرا" میں لکھتے ہیں کہ "وہ وجاہت صوری اور حسن سیرت" میں بہرہ وافی رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی وہی خوبصورتی اور صفائی ہے۔ وہ اس دور کی پیداوار تھے جہاں ادب و اخلاق کو سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ ان کے کلام میں جابجا ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر با اخلاق اور بامروّت انسان تھے۔

یہاں پر بیانؔ کی شاعری کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا جا رہا۔ بلکہ یہ چند سطریں بطور تعارف کے ہیں۔ اگر اُن کی شاعری کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنا ہو تو مغلیہ دور کے آخری ایام کی تاریخ کو مدنظر رکھنا ہوگا اور اس دور کی سیاسی، اور معاشی

حالات کا جائزہ لے کر، بیاںؔ کا مرتبہ قائم کرنا پڑے گا۔

یہاں تو اصل مقصد بیان کا انتخاب پیش کرنا، اور مختصر تعارف کرانا ہے۔ بیاںؔ کی شاعری عاشقانہ ہے اور وہ ہر وقت "تصور جاناں کئے بیٹھے" رہتے ہیں لیکن ان کی دنیا صرف خوابوں کی دنیا نہیں ہے بلکہ وہ اس دنیا کی گہما گہمی میں جیا چاہتے ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار عاشق کی کیفیات رکھتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر وصل محبوب ہی رہے تو عشق میں گرمی نہیں رہتی لیکن ہمیشہ وصل کی تڑپ اور اس کا کبھی نصیب ہی نہ ہونا عشق کی تکمیل نہیں ہے۔

ان کے یہاں بھرپور تغزل ہے۔ اور غزل کے تمام مضامین بڑی خوبی، اور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ باندھے گئے ہیں۔ اُن کا دیوان بہت مختصر ہے۔ جس میں متفرق اشعار کو چھوڑ کر، ۱۵۵ غزلیات، ۲۴ رباعیات، ۳ قطعات، ۳ مخمس، ۲ مسدس مرثیے، ۴ قصیدے۔ اور ۲ مثنویاں ہیں لیکن تمام کلام میں کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جو اس دور میں رائج ہوا اور بیاںؔ نے اپنے یہاں جگہ نہ دی ہو۔ حُسن و عشق کی تمام منزلیں انھوں نے طے کی ہیں لیکن بادہ نوشی کے متعلق بیاںؔ نے بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں۔ اور ان کا یہ موضوع خاص معلوم ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ انھوں نے اسی موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ جو انتخاب میں ملاحظہ ہوں۔

ان کے مزاج میں درویشی اور قناعت تھی۔ قناعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کی مدح نہ کی ہو کیونکہ اُس زمانے میں شاعر کی گذر اوقات کا عموماً ذریعہ شاعری ہی ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اور اس کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنا، گوارا رکھتے تھے۔ ان کو سب سے بڑا اللہ کا سہارا تھا کیونکہ وہی مسبب الاسباب ہے۔ ؎

رکھ مسبب پہ نظر صرف وہی کافی ہے   ہے اگر مرد تو خاک عالم اسباب میں ڈال

ہو دو زانو اغنیا کے پاس مت قالین پہ بیٹھ

پاؤں پھیلا بوریے پر، اپنے گھر میں سو حلال

مگر ایسا نہ ہو سکا۔ دلی لٹی۔ اور اس طرح خون کا دریا بہا کہ کوئی خاندان ہوگا جو اس کی لپیٹ سے بچا ہو۔ جن کے آگے خوانِ نعمت تھے، ان کے بچوں کی ہتھیلی پر کوئی سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی رکھنے والا نہ تھا۔ بیاںؔ بھی حیدرآباد چلے گئے۔ اور دربار میں رسائی بھی ہوگئی مگر اس طرح نہیں جس طرح داغؔ اور غالبؔ کو حیدرآباد اور رام پور، یا ذوقؔ کو دہلی کے دربار میں۔ ان حالات میں بھی انھوں نے قناعت کا دامن کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اگرچہ خاک برابر کیا فلک نے بیاںؔ   دماغ پر وہی ہم خاکسار رکھتے ہیں

گر میری خبر پوچھیں بیاںؔ، حضرتِ آصفؔ   کہیو، اِسی کوچے میں بدستور پڑا ہے

تصوّف کا وہی نظریہ نفی ہے کہ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے، آدمی کی اپنی ہستی کچھ نہیں

وہ دیدار تو وہ اصل بغل میں ہے بلکہ کچھ اس سے بھی نزدیک لیکن اپنا ضعفِ بصارت ہے کہ نظر نہیں آتا۔

یار ہے اپنی بغل میں، بلکہ کچھ اس سے قریب
ڈھونڈتا ہے مثلِ نابینایاں جس تس کے پاس

ہے ضعفِ بصارت سے مانعِ دیدار وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

بیاں نے محاورے اور امثال کو بڑی خوبی سے باندھا ہے۔ اور داغ کی طرح اس امر کی کوشش نہیں کی کہ محاورہ باندھا ہے بلکہ اس جگہ ہی محاورے کو جگہ دی ہے جہاں اس کی بندش نہایت ہی موزوں ہے۔ انتخاب میں اس بات کی رعایت رکھی ہے کہ چند اشعار ایسے بھی چنے جائیں جن میں محاورے استعمال کئے گئے ہیں۔

اُن کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک با اخلاق اور با مروّت انسان تھے۔ وہ صورت پر سیرت کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک سُرخ و سفید رنگ کی ہے کیا اگر سیرت نہ ہو صورت حیوان ہے نہ کہ انسان۔ اسی لئے انھوں نے پاس ادب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

سیرت کے ہم غلام ہیں، صورت ہوئی تو کیا سُرخ و سفید مٹّی کی مورت ہوئی تو کیا
گل نے یہ خوبیاں کہاں پائیں جو کہ رکھتا ہے رنگ و بو اخلاص
بہرہ نہیں ادب سے جسے آدمی نہیں انسان کو ضرور ہے، اے مہرباں لحاظ
پاس ادب سے گرچہ نفس خون ہوا مرا لیکن دیا نہ ہاتھ سے میں نے بیاں لحاظ

اُن میں لحاظ و پاس اور مروّت اس قدر تھی کہ انھوں نے اپنی مثنوی ”زوال ابر اور دے سخن بہ میر سجاد“ میں اپنے معترض کا نام تک نہیں لکھا۔ جس نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ ”خطِ استوا“ آسمان پر نہیں زمین پر ہے۔ اس مثنوی میں طنز ضرور ہے مگر کوئی شعر رکیک، یا تذلیل آمیز نہیں ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انہیں معترض کا نام معلوم نہیں تھا مگر جب وہ مثنوی اعتراض کے جواب میں لکھ سکتے تھے تو کیا معترض کا نام معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بات اور یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہم عصر شعراء سے کبھی بغض و عداوت نہ رکھی اور نہ ان کو کبھی حسد ہوئی۔ چونکہ وہ منکسر المزاج، بھلی طبیعت، اور فراخ دل انسان تھے، اسی لئے اپنے اشعار میں اپنے معاصرین کی بڑائی کی ہے۔ ؎

کیا اس زمیں میں زورِ طبیعت کرے بیاں
مضمون اس کے لے گیا سجاد لوٹ کر

(میر محمد سجاد خلف میر محمد عظیم)

اس غزل پر گر فغاں ریجھے تو یہ پڑھیو بیاں
میں تو اس لائق نہیں۔ یہ لطف فرماتے ہو تم

بیاںؔ جب میں بیاں کرتا ہوں یہ مضمون معشوق کا — کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو جی ڈوب جاتا ہے

انھوں نے کبھی سرقے کی کوشش نہیں کی۔ اگر انہیں کسی کا شعر پسند بھی آگیا اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ شعر کس کا ہے تو اس طرح لکھا ہے:

بیاںؔ مجھ کو بھایا یہ مصرع کسی کا

"مرا نام بھولے، تجاہل کے صدقے"

بیاںؔ نے "چیچک نامہ" لکھا ہے۔ اپنے زمانے میں بہت مشہور ہوا ہے۔ اس کی تعریف میر حسنؔ نے بھی کی ہے لیکن اس کو "مرثیہ نامہ" لکھا ہے۔ اور قدرت اللہ قاسمؔ نے اسے "چنگ نامہ" لکھا ہے لیکن یہ دونوں نام غلط ہیں۔ بلکہ اس کا نام "چیچک نامہ" ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

آہ وا ویلا زدست روزگار — قوش خانوں میں ہے یہ غم روبکار

یہ ساتواں شعر ہے:۔ میرزا فیضو کی چیچک مر گئی — قوش خانے جگ کے ویراں کر گئی

اور آگے بھی ایک شعر ہے۔

سو کیا اس کو فلک نے یوں ذلیل — مرتے ہی چیچک کے یہ بگڑا ہے نیل

بیاںؔ نے غزل کے بعد رباعیات کو ترجیح دی ہے۔ اور ان کی رباعیات کی تعریف عشقیؔ شورشؔ۔ میر حسنؔ۔ اور قاسمؔ نے بھی کی ہے۔ بیاںؔ خود اس طرح کہتے ہیں۔

مذکور سے جب اپنے وہ شرماتا ہے — یہ مجھ سے کہے ہے اور اکتاتا ہے

بس تھوڑی کہیں رباعیاں تم نے بیاںؔ — اتنا بکنا بھی خوش نہیں آتا ہے

بیاںؔ کا نظریۂ شاعری یہ تھا کہ شعر میں صرف قافیہ پیمائی ہی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ جب طبع موزوں ہو اسی وقت شعر کہنا مناسب ہے۔ وہ شعر پھیکے اور بدمزہ ہوتے ہیں جن میں آورد ہوتی ہے۔ شعر پرلطف ہونے چاہئیں اور اُن میں چاشنی ہونی چاہیے ان کا کہنا ہے کہ اسی لیے انہوں نے اپنے اشعار کو "تر" بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہمنشیں۔ مزہ بہت حق ہے جو آجاوے وہ آپ

ورنہ بے لطف ہے مضمون کہ آورد کے ساتھ

اشعار تر کا مرتبہ دون ہے اگر بیاںؔ — تشبیہ اُن کو دے گہر آبدار سے

بیاںؔ کے سن پیدائش کا تو علم نہ ہو سکا۔ مگر یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال حیدرآباد میں ۱۲۱۳ھ میں ہوا۔ اُن کے ایک شاگرد جگل کشور چند ہمدم نے تاریخ کہی۔

"اُستاد از جہاں رفت"

یہ ان کا مختصر سا تعارف، اور سرسری جائزہ ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو بیاںؔ کا "انتخابِ کلام" پیش کرنا ہے۔ اہل حضرات ان کے کلام سے بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس پایہ کا کلام ہے۔ سو حاضرِ خدمت ہے۔

۱

کیا کیجیے بیاں اس کے وجوب اور قدم کا　　طاقت نہ زباں کی ہے، نہ مقدور قلم کا
آدابِ مدحِ نعمتِ پیمبر نہ ادا ہوں　　لوں خامہ صفت منہ سے اگر کام قدم کا
کیا مدح کروں آل اور اصحاب کی اس کے　　یہ مرتبہ کب ہے مری تحریر و رقم کا
بندے سے ثنا حضرتِ استاد کی کب ہو!　　مظہر ہے خداوند کی وہ شانِ اتم کا
سنتا ہے بیاںؔ! عذر ترے سب ہیں یہ مسموع
کیا مدح کرے جس کو سلیقہ نہیں ذم کا؟

بہانہ دل نے سورش کا بنایا اُس کی محفل میں　　جو ٹک مے کی مدد ہوتی قیامت ہائے ہو کرتا
اگر پیرِ مغاں کے ہاتھ لگتی خاک مستوں کی　　تو از بس قدرداں تھا خم بناتا یا سبو کرتا
جفا اک لمحہ جو کرتا نہیں ہے وہ تو مرتا ہوں　　ستم ہوتا اگر الطاف سے میں اس کے خو کرتا
بیاںؔ محفل بہ محفل ڈھونڈتا تھا جس کو کاش! اس کی
میں اپنے دل کی خلوت گاہ ہی میں جستجو کرتا

بس عیادت کو اس کا آنا تھا　　گویا آزار یاں بہانا تھا
پر جلے آ گئے تیر سے اُڑتے ہوئے　　عرش پر جس کا آشیانا تھا
میں نے جس دن کہ دل دیا تجھ کو　　آہ ظالم! تجھے نہ جانا تھا
کبھو میری زباں پہ تھا مجنوں　　ق　کبھو فرہاد کا فسانا تھا
نام اوروں کا لے کے در پردہ　　حال اپنا اُسے سُنانا تھا
آج اک حرفِ آرزو مجھ سے　　بعد مدت کے اُن نے مانا تھا
آفت آوے ان آشناؤں پر　　کیا اِسی وقت ان کو آنا تھا
در تو کھولا نہ پاسباں نے رات　　سر تھا اور اس کا آستانا تھا

اب نباہے ہی شرمِ عشق بنے
یا زباں پہ بیاں نہ لاتا تھا

بیاںؔ تیرے کوچے سے چلتا رہے گا — مری جان! تو ہاتھ ملتا رہے گا
نہیں اشک آنکھوں میں تھمتا کہاں تک — یہ لڑکا نگھوڑے میں پلتا رہے گا
بیاںؔ کیا کہوں نرک تازی میں اس کی ق — ادھر جب تلک تو سنبھلتا رہے گا
کہ تیزے سے آکر نگہ کے وہ قاتل
ادھر دل پہ دل لے کے چلتا رہے گا

میں ہی بلاکشی سے نہ مجبور ہو گیا — وہ بھی جفا کے کرتے میں معذور ہو گیا
کیا محتسب نے میکدہ ویراں کیا ہے آج ؟ — میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا
مستی کو چھوڑ جن نے کیا زہد اختیار — گویا وہ مے کے قطرے سے انگور ہو گیا
سُرمہ سیاہ بخت پسا مفت میں بیاںؔ — کاجل بتوں کی آنکھوں میں منظور ہو گیا
ہر چند تھا یقیں کہ آنے کا وہ نہیں — اس پر بھی انتظار کیا، ہم نے کیا کیا
آئے تھے اس جہاں میں جس کام کے لیے — سو وہ نہ ایک بار کیا ہم نے کیا کیا
اظہارِ عشق کر کے ہم اپنے تئیں کو آپ — آنکھوں میں اس کی خوار کیا ہم نے کیا کیا
ذلت سوائے فائدہ دیکھا نہ کچھ بیاںؔ
کیوں عشق اختیار کیا ہم نے کیا کیا

عالم کو لعل و گوہر و تاج و لوا دیا — اے آسماں! بتا تو مجھے تو نے کیا دیا
ایسے ہی بخت میرے جو ماتے تھے نیند کے — خوابِ عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا
پیری کا جیب چاک ہوا اے کاش! مثلِ صبح — ان نے مرے چراغ کو دل کے بجھا دیا
آتا تھا کچھ ہمیں بھی کبھو شعر یا سخن، — اب تو کسو کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا
اس کا ادائے شکر بیاںؔ کیوں کہ کر سکے
جن نے اٹھا کے خاک سے انساں بنا دیا

اس تجاہل پہ میں اس کے تڑپتا ہوں حشر تک — وہ کہ جس کی چشم کا بھر عمر میں بیمار تھا
میری بیماری سے بھی گویا خبر اس کو نہ تھی — پوچھتا ہے آج لوگوں سے، کیا آزار تھا؟
ہو گیا تو اس قدر مجبورِ الفت میں بیاں
ایک دن وہ تھا کہ اپنے دل پہ تو مختار تھا

کوئی کسی کا کہیں آشنا نہیں دیکھا — سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا
یہ لوگ منع جو کرتے ہیں عشق سے مجھ کو — انہوں نے یار کو دیکھا ہے یا نہیں دیکھا؟
بہ رنگِ سایہ و خورشید اے بیاں میں نے
کبھو رقیب سے اس کو جدا نہیں دیکھا

کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا — ایک بیگانہ ہے مجھ سے اور سب سے آشنا

آسودگی یقین گر بعدِ مرگ ہوتی — میں جیتے جی ہی اپنے زیرِ زمیں سماتا
تشبیہ جب سے دی ہے تیرے بدن سے میں نے — گل، پیرہن میں اپنے پھولا نہیں سماتا

نقدِ دل اپنے کو دے کر، لی اذیت عشق نے — ہائے دیوانے! یہ کیا سودا ہے تو نے کیا کیا
کل تو جوں توں صبح کی امید میں کاٹی تھی رات — آج پھر اس پھر اس حیلہ جُو نے وعدۂ فردا کیا

آئے اب نعش پہ میری تو کیا — حیف ٹک قصد پیشتر نہ کیا
ایک دم وصل، اس میں بھی رنجش — میں نے یہ ذکر جان کر نہ کیا
کیا غبار اس کے دل میں تھا کہ بیاں
خاک پر بھی مری گزر نہ کیا

یہ جائے خون ہو کر گو دل تری جفا سے — مجھ سے تو، یار! شکوہ تیرا نہ ہو سکے گا
اس راہِ عاشقی میں چلنا اُسے روا ہے — سر اولِ قدم پر جو شخص کھو سکے گا

تقلید کر بیاں کی، نہ کیا تو ہوا بوالہوس بھی
پر لخت دل مژہ میں کیونکر پرو سکے گا

دل نہیں، عاشق تو ٹھنڈی سانس بھرنا ہے کیا؟
منہ کو اس کے دیکھنا اور چشم تر کرنا ہے کیا؟

وصل اپنی زندگی اور ہجر اپنا مرگ ہے
ہم نہیں واقف کہ جینا کیا ہے اور مرنا ہے کیا

مہرباں میرے، بھلا اتنا تو مجھ سے اس قدر!
مزرع دل میں میرے یہ آن کر چرنا ہے کیا؟

دامن ترے لگ لوں، اگر دے رہنا مجھے
یہ ناتواں غبار اگر یاں رہا رہا

آتے دیکھا اس کو پھر واقف نہیں دل کیا ہوا
کچھ نہ سمجھا میں کہ ہوتے ہی مقابل کیا ہوا

لیلیٰ آتی ڈھونڈتی، اے قیس تب کچھ لطف تھا
بھول کر آیا اگر وادی میں محمل، کیا ہوا؟

لے کے دل اس شوخ نے اک داغ سینے پر دیا
جو لیا اس کا عوض اس نے مجھے بہتر دیا

جو سلوک اب دل میں آوے کر، مجھے تقدیر نے
دست و بازو باندھ کر تیرے حوالے کر دیا

بعضے ہی اوقات راحت ہم کو دی ہے چرخ نے
رنج و غم ہی اس ستم گر نے بیاں اکثر دیا

ہم کو فلک نے سہو سے ٹک چین اگر دیا
تو یاد کر کے پھر وہیں دکھ بیشتر دیا

دو منہ کھلے انار ہیں اب چشم خوں فشاں
آخر یہ دوستی نے تمہاری ثمر دیا

ہرچند تیرے عشق میں رسوا ہوا بیاں
لیکن تجھے تو شہرۂ آفاق کر دیا

ساقی! سبو کو دیکھ کے ٹک جام دے ہمیں
سارا ہے اس پہ موسم برسات کاٹنا

حاجت کو اپنی کس سے کہے جا کر اب بیاں
اس بات کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا

سیرت کے ہم غلام ہیں، صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید مانی کی مورت ہوئی تو کیا

خوں بہا قتل سے پہلے مجھے قاتل نے دیا
گوشۂ چشم سے اشک داب کے لب دیکھ لیا

[illegible] جب آیا رخصت کا دل سن کر تو من مار رہا
پر آنکھوں نے طوفاں کیا، وہ پار رہا میں وار رہا

ب

جو دیکھتا ہے اس کے رخسارِ باصفا کو
نکلے ہے اس کے منہ سے بے اختیار کیا خوب

وہ بات جب کہے ہے محفل میں بن سنے ہی
کہتا ہوں دور بیٹھا میں بار بار، کیا خوب

یار نے جب اٹھایا اپنے چہرے سے نقاب
طعن کرنے سے مرے ناصح کو آتا ہے حجاب

کل تو آوے گا ہی آخر غرۂ ماہِ صیام
آج تو پی لیجیے، من مانی ساقی! شراب

یہ حسابِ دوستاں در دل مثل مشہور ہے
ہیں عجب دے دوست جو دل ہی میں کرتے ہیں حساب

کیوں کہ عیسیٰ کا دہن کہیے کہ ہے جامِ شراب
جی سا آجاتا ہے جب سنتا ہوں میں نامِ شراب

اپنی مخموری نے اے واعظ نصیحت کی مجھے
واقعی میں آج سمجھا یہ ہے انجامِ شراب

کیا آگ لگ رہی ہے سینے میں، کس سے کہیے!
اے چشم! اشکباری جواب نہیں تو پھر کب؟

جاتا ہے وہ کہ جس سے تھا لطفِ زندگانی
آتی اجل ہماری جواب نہیں تو پھر کب؟

برسے ہے ابرِ رحمت ساقی! کدھر ہے مینا؟
ہنگامِ بادہ خواری جواب نہیں تو پھر کب؟

دل سا گہر تو میرا گم اے بتاں ہوا ہے
ہو مجھ کو بے قراری جواب نہیں تو پھر کب؟

آنکھوں میں کاٹنی ہے جنہیں رات ہجر کی
تیر و پلنگ ہے انہیں گویا پلنگ و خواب

پھولوں کی سیج بن جنہیں آرام ہی نہ تھا
کب ان کو گور میں ہے میسر پلنگ و خواب

لگتا ہے چشمِ بد دور، روئے نگار کیا خوب!
آغاز سی ہوتی ہے خط کی بہار کیا خوب!

ت

کیا قیامت زہرِ قاتل ہے تری، ساقی! شراب
صبحِ محشر سے ورے ہوتے نہیں بیدار مست

کیا کہوں کیا کیا امنگیں دل میں آتی ہیں بیاںؔ جب نظر پڑتا ہے تنہا مجھ کو وہ مے خوار مست

ش

وصل ہی اس کا دوا ہے مری بیماری کو اور کچھ کرتے ہیں تدبیر یہ غمخوار عبث
یار تنہا ہے پھر ایسا نہیں ملنے کا وقت شرم ہوتی ہے مری مانعِ گفتار عبث

ج

تو بزم سے اُٹھا کہ ہوئی تلخ مے کشی میں سچ کہوں شراب کو سمجھا حرام آج
خُم جس کے پاس ہے وہ فلاطوں سے کم نہیں جمشید وہ ہے جس کو میسر ہے جام آج

چ

مُشتِ غبار میرے کو واں ہووے کیا پہنچ ! جس کی گلی میں رکھتی نہ ہووے صبا پہنچ
کیا پاس راہِ عشق سے ہے آستانِ حق ! ایدھر رکھا قدم کو اور اودھر گیا پہنچ
اے بے خبر بیاںؔ کا بُرا حال آج ہے جاتا ہے اس کے پاس تو جلدی سے جا پہنچ

ح

کروٹیں لیتے ہی لیتے آہ پہلو تھک گئے کوئی ہمسایوں سے پوچھے یہ بھی شب ہوتی ہے صبح
ان دنوں میں گرچہ سیرِ باغ میں ہیں خواب و خیال ہو بغل میں یار جس شب تو عجب ہوتی ہے صبح
ہجر کی شب کی سحر کا میں نہیں منکر بیاںؔ لیک پہنچا کر ہمارا جان، بہ لب ہوتی ہے صبح

خ

نہ فقط یار بن شراب تلخ عیش و آرام و خورد و خواب ہے تلخ
میٹھی باتیں کدھر گئیں پیارے اب تو ہر بات کا جواب ہے تلخ
وہ شوخ مجھ سے ہی تنہا نہیں ہوا گستاخ ہمیشہ عشق کی خدمت میں حسن تھا گستاخ
کہاں یہ ہاتھ مرا اور کہاں وہ دامنِ پاک تمہارے لطف و کرم نے مجھے کیا گستاخ

حضور میں بھی جتانے لگا کچھ اپنا عشق　　بیاں کو آپ نے یاں تک تو کر دیا گستاخ

د

جو سیر باغ کو جی چاہے ہے، دیکھ آئینہ　　کر اپنے گھر ہی میں پیارے بہار ہے موجود
ہمارا ضعف بصارت ہے مانع دیدار　　دگر نہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

ذ

یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ　　بلا سے پھاڑ کے ہاتھ میں ملے کاغذ
تمام شہر میں تشہیر میرے بدخو نے　　پیام بر کو کیا، باندھ کر گلے کاغذ

ر

لینا اگر ہے دل کو تو لے بھی کہیں شتاب　　سینے میں اب تلک تو رکھا ہے کوٹ کر
کیا اس زمیں میں زورِ طبیعت کروں بیاں　　مضمون اس کے لے گیا سجاد لوٹ کر

میں پیار کی نگہ سے مرتا ہوں، مجھ کو ظالم!　　کرتا ہے قتل ناحق تیوری چڑھا چڑھا کر
محفل میں اس کی جا کر اشعارِ عاشقانہ　　پڑھتے تھے، قابلیت اپنی جتا جتا کر

کبھو ہم تم بھی ہم آغوش یوں گلشن میں رہتے تھے　　کھڑے ہیں تاک اب جس طرح باہم ہاتھ گہہ گہہ کر
جو عالی ظرف ہیں کب جاہ کو اپنی جتاتے ہیں　　مگر کم حوصلہ بلبل نے ڈالا شور چہچہ کر

ز

مت ستا مجھ کو آن آن عزیز　　ملک کیا بھی کسی کا مان عزیز
کیوں کر دل اُس سے پھیر لوں ناصح!　　جس سے رکھتا نہیں ہوں جان عزیز
دل سے خادم ہوں ہیں بیاں اُن کا　　جتنے ہیں میرے مہربان عزیز

س

ہے تو عزت پر اذیت بھی کچھ اس سے کم نہیں	جو کوئی محفل میں بیٹھے صاحبِ مجلس کے پاس
یار ہے اپنی بغل میں بلکہ کچھ اس سے قریب	ڈھونڈتا ہے مثلِ نابینا بیاباں جس تس کے پاس

ش

گو سب نے بھلا دیا ہے اے یار!	پر تو تو مجھے نہ کر فراموش
کیا ایسے سے دردِ دل کہیے؟	ادھر تو سُنا، اُدھر فراموش

ص

ہے زبانی ہی رُو برو اخلاص	دل میں رکھتا ہے کس سے تو اخلاص!
گل نے یہ خوبیاں کہاں پائیں	جو کہ رکھتا ہے رنگ و بُو اخلاص
یاد ہے کچھ بھی وہ بیاں کا ربط؟	اب تو گویا نہ تھا کبھو اخلاص

ض

آہ اب وہ مدعی کرتا ہے کب آنے کی عرض	جن نے بن پوچھے ہی کی دا آئے مرے جلنے کی عرض
کہہ رہا "میری کرو تدبیر کچھ پیش از بہار"	کان دھر عاقل کہاں سنتے ہیں دیوانے کی عرض
گو کہ رکھتے ہیں زبانِ چرب ہم لیکن بیاں	کان میں اُس زلف کے مقبول ہے شانے کی عرض

ط

جلنے لگے ہر ایک طرف صبح و شام خط	آیا وہ رو سیاہ کہ جس کا ہے نام خط
لکھتا ہوں سرگذشتِ شبِ ہجر میں بیاں	ہوگا نہ روزِ حشر تلک اختتام خط

ظ

وہ جانِ جاں تو چھوڑ گیا بے ملاحظہ	اب تن سے کیوں نکلنے میں کرتی ہے جاں لحاظ

بہرہ نہیں ادب سے جسے آدمی نہیں،   انسان کو ضرور ہے، اے مہرباں! لحاظ
اس بے ادب سے گرچہ نفس خوں ہوا مرا   لیکن دیا نہ ہاتھ سے میں نے بیاںؔ لحاظ

ع

جو پتنگوں کے جلانے کا سبب ہوتی ہے شمع   تو انھوں کے غم میں رو رو جان بھی کھوتی ہے شمع
یہ سرِ رشکِ آتشیں کیا ہے سمجھتا ہے کوئی   دل میں پروانوں کے تخمِ دوستی بوتی ہے شمع
مرگ سے غافل نہیں جو شخص ہیں روشن ضمیر   صبح کے ڈر سے بیاںؔ شب کو نہیں سوتی ہے شمع

غ

اس بڑھاپے میں بھی ہے اک عشق کا سینے میں داغ   ہو چکی ہے صبح اور روشن ہے اس گھر میں چراغ
جان کر معنیٔ کسی کے میں نہیں باندھے کہیں،   صاحبِ خرمن کو کب ہے خوشہ چینی کا دماغ

عرض لیتا ہم زبانوں کے سلیقے کی بیاںؔ
اس دلِ نالاں کے شیون سے اگر پاتا فراغ

ف

ہووے گا ذوقِ حسرتِ دیدار میں خلل   شیریں گزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف
یاں تک تو سیرِ جاں سے ہے مجنوں ترا کہ میں   ق   لے کر چلا تھا خانۂ فصّاد کی طرف
وہ خوں گرفتہ راہ میں کہنے لگا مجھے   "لے چل خدا کے واسطے جلّاد کی طرف"
باتوں میں آہ کن نے لگایا اسے بیاںؔ؟   رکھتے تھے کان ٹک مری فریاد کی طرف

ق

بظاہر تو عاشق ہی ہوتے ہیں قرباں   بہ باطن ہیں معشوق قربانِ عاشق
بیاںؔ اس برابر نہیں کوئی دولت   کہ معشوق ہووے ثنا خوانِ عاشق

ک

گو کہ صورت ہے خوب تیری لیک　　چاہیے آدمی کی سیرت نیک
مجھ سے، اے دل ربا! تجھے لاکھوں،　　ق　نہیں ملتا ہے مجھ تجھ سا ایک
قرض میں نے کیا لا کوئی　　دوسرا دل کہاں سے لاؤں لیک

ل

آسماں سے طمعِ نعمتِ الواں مت رکھ　　ہے پڑی اوندھی، نہ ہاتھ اپنا تو اس قاب میں ڈال
رکھ مسبب پہ نظر صرف وہی کافی ہے　　ہے اگر مرد تو خاک عالمِ اسباب میں ڈال

م

پھرا ہے نظروں میں ایسا پھکیت چابک دست　　کہ نیمہ راہ میں ناظر کے ہو نگاہِ قلم
دلوں کے درد کی تشریح سخت مشکل ہے　　اب اس میں خواہ زباں ہو رفیق خواہ قلم
سخن کے لکھنے کا ڈھب کس طرح بیاں کو رہے　　کہ منہ دوات کا دیکھے نہ سال و ماہ قلم

میں بھی میاں کچھ آدمی ہوں مجھ سے شرماتے ہو تم　　دیکھ کر مجھ کو عبث مجلس سے اُٹھ جاتے ہو تم
بات کچھ اس کی نہ سمجھا ڈر سے میں کہتا تو تھا　　"بندہ پرور! یوں ہی ہے جس طرح فرماتے ہو تم
جانتا ہوں دشمنِ جانی ہو اس میں شک نہیں　　جی سا آجاتا ہے لیکن جس گھڑی آتے ہو تم
کوئی بھی بکنے سے دیوانوں کے ہوتا ہے ملول!　　بات میری کیا جسے خاطر میں کچھ لاتے ہو تم
اس غزل پر گر فغاں رہیے تو یہ پڑھیو بیاں　　میں تو اس لائق نہیں، یہ لطف فرماتے ہو تم

ہو دو زانو اغنیا کے پاس مت قالین پہ بیٹھ　　پاؤں پھیلا بوریے پر اپنے گھر میں سو مدام
زندگی ہوگی بیاں تو وصل بھی ہوگا کبھی　　دل کو ٹک ہنس بول کر بہلا، مت اتنا رو مدام
رخصت کرتے ہی مر گئے ہم　　ایدھر گئے تم، اُدھر گئے ہم

ن

آگے تو زلف ہی فقط مار رکھے تھی جال میں　　دام بچھا گئے ہے یہ خط ادا اب اک حال میں

... ہے کہ یارانے سے جس کے رکھے مار　　خواب میں کیجے نت گزارا رہے سدا خیال میں
...تی میں گر قلم ہوں تو روا ہے یہ ستم　　مثلِ نگاہِ یار ہم مست ہیں اپنے حال میں
... بیاں ہی تھا کریں، بس وہی ایک ہم نشیں　　یا کہیں بات ہی نہیں اب کبھو ماہ و سال میں

چھٹے جب دام سے تیرے تو کب ہم ہاتھ لگتے ہیں　　کوئی شہباز، اے صیاد! ہر دم ہاتھ لگتے ہیں
ترے آنے سے آگے اگر کوئی ڈھونڈے ہمیں پاوے　　طلوعِ خور سے پہلے مثلِ شبنم ہاتھ لگتے ہیں
پھنسا ہے دام میں تیرے ہما یعنی بیاں کا دل　　نہ ہو غافل کہ صید ایسے بہت کم ہاتھ لگتے ہیں

دیکھ کر گرمی تری کتنوں کے جگر جلتے ہیں　　پڑیں چولھے میں جو یہ پست نظر جلتے ہیں
بے ہنر مجھ سے کو دیتا ہے خدا اتنا کچھ　　کہ جسے دیکھ بہت اہلِ ہنر جلتے ہیں

بیٹھے ہیں عنایات کی امید پہ اغیار　　میں ہوں کہ عقوبت کا سزاوار کھڑا ہوں
اتنا بھی ستم کیا ہے، ٹک انصاف تو کر تو　　تسلیم، آگے ترے خوں خوار کھڑا ہوں
کہتا ہے "بیاں! سر نہیں لاتا ہے تو آگے　　میں کب سے لیے ہاتھ میں تلوار کھڑا ہوں

ہمیں ہی شمع رو اپنا نہ دیوانے بناتے ہیں　　چمن سے بلبلوں کو کھینچ پروانے بناتے ہیں
اٹھا دیتے ہیں اک پل میں، منا لیتے ہیں اک پل میں　　غرض عاشق کے تئیں اپنے یہ جانانے بناتے ہیں
سلاطیں راج بیٹھے قدر گوہر کی سمجھتے ہیں　　ہم اُن کے گوش کی خاطر یہ دُر دانے بناتے ہیں
ہماری بھی کہانی کل بیاں یوں ہی بنا دیں گے　　کہ جیسے آج ہم لوگوں کے افسانے بناتے ہیں

چراغِ گور نہ شمعِ مزار رکھتے ہیں　　بس ایک ہم یہ دلِ داغ دار رکھتے ہیں
مری زبانی کوئی اس سے اس قدر پوچھے　　کہیں یہ جھوٹے بھی وعدے شمار رکھتے ہیں
قیامت آ چکی دیدارِ حق ہوا سب کو　　ہم اب تلک بھی ترا انتظار رکھتے ہیں

اگرچہ خاک برابر کیا فلک نے بیاں
دماغ، پر وہی ہم خاکسار رکھتے ہیں

نہیں میں بوسہ لیا، ہونٹ پیارے چوسے — جو اس پہ روٹھے تو آپ اختیار رکھتے ہیں

قبولِ خلق خدا اس قدر نصیب کرے — ق بیاں کے حق میں جو الطاف یار رکھتے ہیں

اِدھر تو دیر میں کرتے ہیں برہمن سب یاد — حرم میں شیخ اُدھر انتظار رکھتے ہیں

دل اب اُس دل شکن کے پاس کہاں — چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

دشمنِ جاں کو دوست سمجھا میں — وہ کہاں، میں کیا قیاس کہاں!

کیا ہوا اُس کو دیکھتے ہی بیاں — ہوش کیدھر گئے، حواس کہاں!

جو زمیں پر فراغ رکھتے ہیں — آسماں پر دماغ رکھتے ہیں

ساقی بھر بھر انھیں کو دے ہے شراب — جو کہ لبریز ایاغ رکھتے ہیں

تیرے داغوں کی دولت، اے گل رو! — ہم بھی سینے میں باغ رکھتے ہیں

چراغِ صبح ہوں یا آفتابِ روزِ آخر ہوں — کوئی ساعت کا مہماں ہوں، کوئی دم کا مسافر ہوں

تمنا بادشاہی کی کسی سفلے کو ہووے گی — مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہوں

ہوس اسباب آزادی کے سب برباد دیتی ہے — گرفتارِ علائق، اے ہوا! میں تیری خاطر ہوں

بیاں باطن میں بدتر آپ کو پاتا ہوں حیواں سے — یہ اُس کا فضل ہے جو صورتِ انساں بظاہر ہوں

جب کہ دلچسپ کسی شوخ کی صورت دیکھیں — دل کے دینے میں نہ عشاق مہورت دیکھیں

اہلِ اخلاص جو مصحف بہ ضرورت دیکھیں — قل ہو اللہ کی بس کھول کے صورت دیکھیں

علم سینے میں یا سفینے میں — یاں سفینے میں ہے نہ سینے میں

ایسی مے ہے کہ بار بن پیجیے — ہے مزہ خونِ دل کے پینے میں

کوئی تیرا عدو نہیں ہے بیاں
آپ مت رہ کسی کے کینے میں

تشبیب سے مدح کی طرف آنے کو گریز کہتے ہیں۔ یہ ایسا نازک مقام ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں لیکن سودا نے "گریز" میں اپنے کمال اور قادر الکلامی کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ مثلاً حضرت امام ضامن کی مدحت میں ایک قصیدے کی تشبیب میں گلۂ روزگار کرتے کرتے کہتے ہیں:۔

نہیں ہے اس کہیں زیرِ آسماں ہرگز
بجز زمینِ خراساں کہ ہے وہ عرش آسا

گریز کے بعد مدح کا نمبر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر اکثر بے راہ روی کا شکار ہوجاتا ہے۔ جو شاعر اپنے ممدوح سے وہ خصوصیات متعلق کر دیتا ہے جو اس میں دراصل موجود نہیں حالی مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:۔

"..... شاعر کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اچھوں کی خوبیوں کو چمکائے۔ ان کے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے اور ان کے اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آئندہ دونوں نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کر جائے اور نیز برائیوں اور عیبوں پر جہاں تک ممکن ہو گرفت کرے تاکہ حال اور استقبال دونوں زمانوں کے لوگ برائی کی سزا اور اس کے نتائج سے ہوشیار اور چوکنے رہیں ..... متوکل باللہ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ تم کس حد تک لوگوں کی ہجو کے درپے رہتے ہو اور کب تک ان کی مدح ستائش کرتے ہو؟ اس نے کہا مَا اَسَاؤُا وَاَحْسَنُوا "یعنی جب تک کہ ان سے بدی اور نیکی سرزد ہوتی ہے۔ پھر کہا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ تَکُوْنَ کَالْعَقْرَبِ الَّتِیْ تَلْسِبُ النَّبِیَّ وَالذِّمِّیَّ "یعنی خدا نہ کرے ہمارا حال بچھو کا سا ہو جو کہ نبی اور ذمی دونوں کے ڈنک مارتا ہے"۔

حالی: مقدمہ شعر و شاعری/ ۱۷۹

لیکن قصیدہ نگار تعریف میں اعتدال سے تجاوز کرجاتا ہے اور سودا نے تو مدح میں اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے کہ ممدوح کی صورت پہچاننی دشوار ہے۔

مدح کے بعد مداح دعا دے کر دستِ طلب دراز کرتا ہے۔ سودا مدح میں اپنے ممدوح کو آسمان پر لاتے سے گریز کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ سودا اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو شاعر ہیں۔ سودا پہلے غزل گو یا قصیدہ نگار یہ مسئلہ آج طے ہو چکا ہے لیکن شیفتہ گلشنِ بیخار میں اس مسئلہ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں کہ:۔

"عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ اس کا قصیدہ غزل سے ۲

۲ بہتر ہے، مہمل بات ہے۔ فقیر کے خیال سے اس کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے" شیفتہ: گلشن بے خار/ ۱۰۰

شمیم احمد - دہم سی

خواجہ میر درد

دردؔ دنیا اور دنیاداری سے آزاد ایک صوفی منش انسان تھے۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شاہانِ وقت کی دربارداری اور حاشیہ برداری تو کجا ان کی محفلوں میں بادشاہوں اور رئیسوں کو عام لوگوں سے زیادہ رتبہ نہ ملتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ شاہ عالم ان کی محفل میں شریک ہوئے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے دردؔ نے کہا کہ محفل میں بیٹھنے کا دستور نہیں۔ بادشاہ نے پاؤں میں درد کا عذر پیش کیا۔ اس پر انھوں نے کہا "ایسا تھا تو یہاں آنا کیا ضرور تھا" ان کے یہاں شاہ وگدا سب برابر تھے دولتِ فقر کے آگے جاہِ سلطنت گرد تھی :۔

دولتِ فقر کے حضور گرد ہے جاہِ سلطنت
کہتے ہیں جس کو یاں ہما اپنی نظر میں زاغ ہے

نہیں مذکورِ شاہاں درد ہرگز اپنی مجلس میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادھم کا

اس بے نیازی اور استغنا کا سبب یہ تھا کہ وہ دنیا کی حرص و ہوس سے آزاد تھے :۔

شاہ وگدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

ہم بھی فلک سے کرتے کسی چیز کی طلب
ڈھونڈھا پر اپنے دل میں تو کچھ چاہ ہی نہیں

دراصل عشقِ الٰہی نے ان کے مزاج میں ایک قناعت پیدا کر دی تھی :۔

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے ان کے متعلق درست ہی لکھا ہے کہ وہ صوفی پہلے ہیں اور شاعر بعد میں۔ ان کی شاعری تصوّف کی تابع ہے، تصوّف شاعری کا تابع نہیں۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی صوفی ہوتے مولوی عبدالسلام ندوی کے الفاظ میں دردؔ نے پہلی بار اردو زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔ مولوی عبدالحی نے تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے آپ کے کلام کو میر و مرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ٹھہرایا ہے ڈاکٹر اعجاز حسین انھیں صوفیانہ شاعری کا سرتاج اور عظمت اللہ خاں

صوفیانہ شاعری کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں "آپ کی عظمت اس بات میں ہے کہ آپ کی شاعری ایک صوفی کی شاعری معلوم ہوتی ہے نہ صرف عقائد و مسائل کی بنا پر بلکہ آپ کی ساری شاعری کا لب و لہجہ صوفیانہ ہے۔ تصوف ان کے لیے محض نظریہ نہیں بلکہ نظریۂ زندگی ہے۔ صرف عقیدت نہیں بلکہ عمل بھی ہے" اب کچھ اس رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بستے ہیں ترے سایے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے

حجاب رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

گر معرفت کا چشمِ بصیرت میں نور ہے
تو جس طرف کو دیکھیے اس کا ظہور ہے

عشقِ حقیقی کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے انھیں عشقِ مجازی کی دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑا تھا جس کے اشارے ان کے کلام میں جا بجا موجود ہیں :-

نہ مرتے ہیں نہ نیند آتی نہ وہ صورت بسرتی ہے
یہ جیتے جاگتے ہم پر قیامت شب گزرتی ہے

بھول جا، خوش رہ عبث وے سابقے مت یاد کر
دردؔ، یہ مذکور کیا ہے، آشنا تھا یا نہ تھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

قتل تو کرتے ہو مجھ کو لیکن
بہت سا آپ بھی پچھتایئے گا

خواجہ میر دردؔ نے بڑا پر آشوب دور پایا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب خاندان مغلیہ کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ امیروں کی بلند حوصلگی اور سپاہیوں کی مردانگی و شجاعت رخصت ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی اور نہ مال۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کے حملوں نے حکومت کا رہا سہا رعب و دبدبہ بھی ختم کر دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دلی اجڑ گئی۔ شاعروں نے بھی یکے بعد دیگرے دہلی سے کوچ کرنا شروع کر دیا لیکن دردؔ نے گوشۂ قناعت سے قدم باہر نہ نکالا۔

قایم، مصحفی، میر اور سودا کا کلام اس عہد کے چشم دید واقعات کی دستاویز ہے۔ لیکن درد کا کلام بھی ان حالات کے ذکر سے خالی نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں۔

دلی خراب کردہ اکنوں دہر کس
جاری شدہ اشک ہائے بجائے نہرش
بودست ایں شہر مثلِ روئے خوباں
چوں خطِ بتاں بود سوادِ شہرش

درد: نالۂ درد/ ۲۰

اردو کلام میں جگہ جگہ تباہی دلی پر طول و دل آزردہ نظر آتے ہیں:۔

جو خرابی کہ درد یاں پھیلی
دستِ قدرت سے کب سمٹتی ہے

ان کے کلام میں جو افسردہ دلی کی لے پائی جاتی ہے اس کا سبب غالباً وہ حالات ہی ہیں جنھیں دیکھ کر انسان زندگی سے ہی بیزار ہو جاتا ہے۔

ہم اپنی عمر میں دنیا سے ہو گئے بیزار
عجب ہے خضر نے کیونکر کہ زندگانی کی

کچھ دل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل
ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے گا شکستہ دل

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

غنچہ ہے دل گرفتہ، گل کا ہے چاک سینہ
گلشن میں ہے تو یہ کچھ آسودگی کہاں ہے

ہم ہی اس وحشت سرا سے نئیں اداس
اور بھی جو آئے یاں سو کم رہے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد غالب نے اپنے دوستوں کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا "ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا" درد اپنے خاص انداز میں یوں گریہ کناں ہیں۔

وہ مر چلے جو رونقِ بزمِ جہان تھے
اب اٹھیے درد یاں سے کہ سب یار سو گئے

غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کے سینے پر چڑھ کر اپنی کٹار سے اس کی آنکھیں نکال لی تھیں اور اسے موتی مسجد کے سامنے خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ دیا تھا۔ میر نے اس کا ذکر ایک شعر میں کیا ہے:۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھوں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

درد کے ایک شعر میں یا تو اسی المناک واقعے کی طرف اشارہ ہے یا مرزا مظہر جانجاناں کی شہادت کا ذکر ہے:۔

پڑی ہے خاک پہ یہ لاش اس رشکِ شہیداں کی
لہو کے آنسوؤں روتا ہے جس کو قتل کر خونی

ہر زبان کی شاعری میں اور خاص طور پر اردو شاعری میں ہم عصروں سے چشمک کی روایت عام رہی ہے۔ چنانچہ میر و سودا، مصحفی و انشاؔ، اور غالب و ذوق کی معرکہ آرائیوں کے قصے آج تک دلچسپی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ سودا کو تو ہجو کے بنا مزہ ہی نہ آتا تھا۔ درد بھی لپیٹ میں آ گئے اور سودا نے ان کی شان میں ہجو کہی :۔

درد کس کس طرح بلاتے ہیں
کر کے آواز منحنی و حزیں

درد نے اپنی متانت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تنبیہ کی :۔

سودا! اگرچہ درد تو خاموش ہے ولے
جوں غنچہ سو زبان ہے اس کے دہن کے بیچ

قدیر احمد صاحب کا خیال ہے کہ سودا جلد ہی راہ پر آ گئے اور اس شعر میں انھوں نے صلح کا اعلان کر دیا :۔

سودا بدل کے قافیہ تو اور کہہ غزل
اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

کلامِ درد درسِ اخلاق ہے۔ درد نے جگہ جگہ نیکی اور خدمتِ خلق کی تلقین کی ہے۔ حقوق العباد کی اہمیت جتائی ہے۔ ضبطِ نفس، وضعداری اور انکسار کی ترغیب دلائی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ اب اگر کوئی چاہے تو اسے پند و موعظت کا دفتر کہہ لے۔ کچھ مثالیں پیشِ خدمت ہیں:۔

کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا
گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

محنت و رنج و غم سے یاں درد نہ جی چھپائیے
بار بھی اٹھائیے جب تئیں سر ہے دوش سے

دیتے ہو عبث شیشہ گراں سنگ کو گداز
پگھلائیے جو تم سے کوئی دل پگھل سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

کعبے کو بھی نہ جائیے دیر کو بھی نہ کیجے منہ
دل میں کسو کے درد بار ہووے تو ایسا کیجیے

آزاد کسی کی بھی اٹھاتے نہیں منت
دیکھا نہ کسی سرو کو تہ بارِ ثمر کا

اب کچھ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:۔

جب نظر سے بہار گزرے ہے
جی پہ رفتارِ یار گزرے ہے

مسکرایا خوشی سے وہ جس دم
باغ میں کب کھلی کلی ایسی

بقیہ صفحہ ۷۵ پر

حفیظ الرحمٰن سہم بی

میر حسن

آپ دہلی میں ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے آپ کا اسم گرامی میر غلام حسن نام حسن تخلص تھا میر غلام حسین صاحب کے فرزند رشید تھے۔ دہلی کی حالت نازک ہونے کی وجہ سے تمام شعرا دہلی ترک کر رہے تھے تو آپ بھی اپنے والد کے ساتھ بارہ سال کی عمر میں اپنا وطن ترک کرنے کے لیے آمادہ ہوئے اور فیض آباد چلے گئے اس وقت فیض آباد حاکم نشین شہر تھا۔ میر حسن نے پہلے والد سے ہی تعلیم و تربیت حاصل کی کچھ مدت کے بعد نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم ہوئے کچھ عرصہ فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ تشریف لے آئے۔

اردو مثنوی آج جس مقام پر کمال شان وضع سے کھڑی ہے وہ اس کی ارتقا کی بلند منزلوں میں سے ایک ہے آج کا ناقد جب مثنوی پر قلم اٹھاتا ہے تو اپنے آپ کو بہت کچھ مطمئن پاتا ہے۔ اردو مثنوی کی موجودہ شکل جو کچھ بھی ہے اسے بنانے میں ہمارے بیشتر شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے مگر جو نام سرفہرست آتا ہے وہ میر غلام حسن کا ہے اگر اردو مثنوی کے مسلسل ارتقا کا بہت غور سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں سب سے پہلے میر حسن کے کارناموں سے ہی واسطہ پڑتا ہے حالانکہ میر حسن نے غزلیات۔ قصاید مراثی رباعیات اور مثنویات دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی غزل گوئی میں آپ کا بڑا درجہ ہے لیکن مثنوی کے اندر وہ کمال حاصل کیا کہ تمام شعرا نے اسے تسلیم کیا ہے۔

ایک جگہ مولانا آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں کہ ظریف طبع۔ خندہ پیشانی شگفتہ مزاج خوش اخلاق شخص تھے۔ آپ نے تہذیب و شائستگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا آپ کا میانہ قد۔ خوش اندام اور گوزا رنگ تھا۔

آپ قوانین شریعت اور آئین خانداں میں اپنے والد کے پابند تھے لیکن داڑھی منڈاتے تھے جب تک دہلی میں رہے، اپنے والد سے اصلاح کلام کرا لیتے رہے۔ میر حسن کو ذوق شعر گوئی وراثت میں ملا تھا۔ اودھ میں آکر میر ضیاء الدین کے شاگرد ہوئے مگر صحیح معنوں میں ان کے پیرو نہ ہو سکے۔ خواجہ میر درد میرزا سودا اور میر تقی میر کے کلام کے نقش قدم پر

چلنے لگے۔ اس میں بھی کافی شہرت ہوئی۔ لیکن زیادہ شہرت آپ کو مثنوی میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"اصلاح سخن از میر ضیا
گرفتہ ام لیکن طرز بیشاں
از من کما حقہ سرانجام نیافت، ہر
قدم دیگر بزرگاں و مرزا رفیع سودا
و میر تقی پیروی نمودم"۔

تصانیف میر حسن کی تصانیف میں ایک دیوان ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا۔ اور گیارہ مثنویاں ہیں لیکن ان سب میں سحر البیان سب سے زیادہ مقبول ہے۔

انداز کلام میر حسن اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ غزل میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے سلاست زبان سوز و گداز کلام میں روانگی اور سادگی بہت ہے۔ نمونے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

سماں تھا کل عجب ہونے سے تیرے شوخ محفل میں
کہ سو سو آرزوئیں مضطرب پھرتی تھیں ہر دل میں

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور
آخر ہوئے سب زیست کے ایامِ عزیز

کیا جانئے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

آغاز محبت میں دیکھا تو یہ دیکھا
کیا جانیے کیا ہو گا انجام مرے دل کا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد
ظاہر کا یہ پردا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ہے
ایک آواز پر دو ساز کے ہیں تار ہے

آپ نے ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ مصحفی نے "شاعر شیریں زباں" سے تاریخ وفات نکالی۔

سحر البیان میر حسن نے سحر البیان میں بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی جملہ ادبی خصوصیات کے لیے بہترین مرقع ہے اور اردو زبان کے اندر ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے جہاں تک خیالات کے اظہار کا تعلق ہے سحر البیان

اپنا جواب نہیں رکھتی۔ محاوروں کا استعمال، بیان کی صفائی اور سادگی سے بھرپور ہے حالانکہ سحرالبیان کا قصہ قیاسی اور فرضی ہے۔ لیکن میرحسن نے ایسا انوکھا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اس محفل میں موجود ہے اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور مثنویاں ہماری زندگی کے روزانہ واقعات میں خاک دخل رکھتی ہیں سحرالبیان کی زبان نہایت بڑھ چڑھکر بیان کی گئی ہے، دریا محاورہ ہوتے ہوئے بھی یہ تعجب ہے کہ مثنوی اس وقت لکھی گئی تھی جب اردو کا بچپن تھا اس زمانے کے اور شعرا کا کلام دیکھیے تو ہر شاعر کے کلام میں بہت سارے ایسے الفاظ ملیں گے جو آج کل بالکل نہیں بولے جاتے ہیں لیکن میرحسن کی زبان میں وہ تمام الفاظ پائے جاتے ہیں جو آج کل بولے جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اردو کے اور شعرا نے مثنویاں نہ لکھی ہوں بڑے بڑے شعرا اس میدان میں نظر آتے ہیں۔ میرتقی۔ مرزا رفیع سودا نے بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

سحرالبیان اور گلزارنسیم

اردو میں مثنویوں کی تعداد میرے نزدیک ہزاروں سے کم نہ ہوگی لیکن بقول مولانا آزاد، ان سب میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی پسند پائی جو سحرالبیان اور گلزارنسیم ہیں۔ دونوں کے راستے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ میں اس بات کو قطعی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ نسیم نے میرحسن کے مقابلے پر مثنوی لکھی۔ دونوں کی بحر مختلف اور اظہار خیال علٰیحدہ۔ پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ گلزارنسیم سحرالبیان سے جواب میں لکھی تجربہ کی گئی ہے۔

میرحسن کی مثنویوں سلاست زبان، روانی کی سادگی پائی جاتی ہے اور نسیم کی مثنوی، معنی آفریں، بلند پرواز نازک خیالی میں فرد ہے۔ میرحسن نہایت ہی سادہ اور سلیس زبان میں بے ساختگی کے ساتھ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اور نسیم کے یہاں الفاظ کی شوکت تشبیہہ کی نزاکت اور بندش کی چستی قابل داد ہے۔

نسیم معنی آفریں ہیں میرحسن تحسین آفریں۔

نسیم کی مثنوی کا ایک بڑا وصف اس کا اختصار ہے ہر واقع کو اس قدر اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شاید اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ کرے۔ لیکن اس کے برخلاف میرحسن کی مثنوی میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے اور یہی اس مثنوی کا سب سے بڑا عیب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درد اور سوز وگداز جو میرحسن کے یہاں ہے وہ نسیم کے یہاں نہیں۔

سحرالبیان میں ایسے الفاظ کم ہیں جو مترادف ہوں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ میرحسن کو زبان پر کس قدر قدرت حاصل تھی۔ وہ زبان کی روش اور اس کے مستقبل پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے۔

سحرالبیان کے محاسن

اردو ادب میں ممتاز ترین درجہ رکھتی ہے

زبان کے لحاظ سے میرے نزدیک جو درجہ نثر میرامن
کی باغ و بہار کو حاصل ہے اس سے زیادہ کئی گنا
سحرالبیان کو حاصل ہے۔ اور زبان پر میر حسن کی سحرالبیان
کا جتنا بڑا اثر پڑا ہے وہ کسی ایک کتاب کا نہیں پڑا۔

سحرالبیان کے بعض شعر ضرب المثل ہو گئے
ہیں اور اردو زبان سے جو لوگ دلچسپی لیتے ہیں ہر خاص
و عام کی زبان پر رہتے ہیں۔ مثلاً

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

میر حسن ایک باکمال مصور تھے۔ واقعات
کی تصویر الفاظ میں اس خوبی سے کھینچی ہے کہ نظر کے
سامنے ہو بہو منظر آجاتا ہے۔ جو خیالات وہ بیان
فرماتے ہیں۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے
آجاتی ہے۔

خیالات کے اعتبار سے سحرالبیان کا درجہ
بہت بلند ہے اس کے ہر شعر میں درد اور سوز گداز
کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔
اشعار اس قدر متاثر ہیں کہ بجلی کی طرح دل
پر اثر کرتے ہیں۔ میر حسن نے یہ مثنوی لکھ کر ملکی زبان
پر زبردست احسان کیا ہے اور جب تک اس
زبان کے بولنے والے دنیا میں موجود ہیں میر حسن
کا نام دلوں پر نقش رہے گا۔

غزل

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا
میرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا
ملا میرے دلبر کو مجھ سے خدا
نہیں تو میرا جی ٹھکانے لگا
گنہ چشم خونبار کا کچھ نہیں
مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا
فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا
نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ حسن
میرا دوست مجھ کو ستانے لگا

غزل یا رباعی و یا کوئی فرد
اسی ڈھب سے پڑھنا کہ ہو جس میں درد

سو یہ بھی جو منہ کو نکلے کہیں
نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں

سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب
نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

گیا ہے جب اپنا ہی جوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

محمد شفیق [redacted] یازدہم اے

غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی مصحفی اردو کے وہ بلند پایہ شاعر ہیں جن کی قدر ان کے مرتبے کے مطابق اب تک نہ ہوئی اور ان کا کلیات اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہند و پاک کی کوئی لائبریری ایسی نہیں جس میں سارا کلام یک جا ہو۔ اس کا سبب ان کی پرگوئی ہے۔ مصحفی کا پورا سرمایہ آٹھ دواوین اور ایک مجموعۂ قصاید پر مشتمل ہے تین تذکرے اور نثری رسالے اس کے سوا ہیں۔ مولانا حسرت موہانی اور دیگر تنقید نگاروں کی نظر میں میر و مرزا کے علاوہ کوئی استاد مصحفی کا مدِمقابل نہیں۔

مصحفی کی ولادت اور ابتدائی تعلیم ان کے آبائی وطن امروہہ میں ہوئی۔ یہیں اس شعور کی تربیت ہوئی جس نے آگے چل کر میدانِ شاعری میں ان کا لوہا منوایا۔ ہوش سنبھالا تو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی امروہہ سے نکل کر ٹانڈہ پہنچے اور آمیر کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ یہاں فراغت سے گزرنے لگی مگر خود بقول مصحفی کے فلکِ کج رفتار کو یہ کب گوارا ہے کہ کسی کی چین سے گزر جائے۔ کہتے ہیں۔

فلک نے سنگ پھینکا تفرقے کا
ہوئے دو چار صاحب دل جہاں جمع

ایک اور جگہ کہا ہے۔

پھینکا ہے آسماں نے زبس سنگِ تفرقہ
اس میکدے میں بر سرِ جام سبوے عیش

یہ محفلِ عیش و نشاط چند مہینے سے زیادہ کی تاب نہ لا سکی اور برہم ہو گئی۔ مصحفی نے یہاں سے رختِ سفر باندھا اور لکھنؤ میں لا کھولا مگر یہ لکھنؤ آصف الدولہ کا لکھنؤ نہ تھا۔ یہاں دل نہ لگا اور پہلی بار دہلی کا رخ کیا۔ دلی کچھ ایسی بھائی کہ یہیں رہ پڑے اور اسی کو وطن سمجھ لیا۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد کے دلی کا خدا جانے کیا میٹھا تھا کہ یہ وطن نہ تھا مگر اسے وطن سے کم کا درجہ نہ دیتے تھے۔ فخریہ کہتے ہیں۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی
میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

یہاں بارہ سال گزرے۔ ستم یہ ہوا کہ اس زمانے کا کہا ہوا بیشتر کلام ضایع ہو گیا۔ ایک شعر میں اس المیے کا ذکر کیا ہے۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

جب بقول مصحفی دلّی کا یہ حال ہوا کہ

"ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے"

تو مصحفی بھی پورب کے ساکنوں میں جا پھنسے اور ایسے پھنسے کہ مرتے دم تک رہائی نہ ملی۔ ساری زندگی دلّی کو بڑی حسرت سے یاد کرتے رہے۔ لکھنؤ والوں کی شکایت اور دہلی کی یاد میں جو اشعار کہے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

اب تو میں دلّی سے کوسوں دور ہوں اے مصحفی
رہنے والا تھا کبھی اس کشورِ معمور کا

مصحفی دلّی میں رہتے تھے کبھی ہم اپنی
عمر گزری کہ وہ آباد نگر چھوڑ دیا

مصحفی دلّی کو پھر کر جو نہ دیکھا ہم نے
کس گھڑی نکلے تھے اس اجڑے نگر سے باہر

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے کیا کیا یہ خدایا تو نے

مصحفی لکھنؤ میں دلّی سے
آیا طے کر کے راہِ دور و دراز
لیکن اس خاک میں بھی اس نے کہیں
کچھ نہ دیکھا بجز نشیب و فراز

انشا سے معرکے

مصحفی کو لکھنؤ والوں کی ناقدری کا ہمیشہ گلہ رہا۔ ان کے حریفوں کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ جاری رہیں اور مصحفی ہمیشہ ان کی شرارتوں کا نشانہ بنے رہے کہتے ہیں:-

ذرا اے مصحفی ان لکھنؤ والوں سے بچتا رہ
کر تو بے شر ہے اور یاں دور رہ، ناداں! شریروں کا

ان شرارتوں میں سب سے خطرناک شرارت وہ تھی جو انشا کے ہاتھوں ظاہر ہوئی۔ ایک زمانا تو وہ تھا کہ انشا کی کوششوں سے مصحفی کی رسائی نواب ٹانڈہ کے دربار میں ہوئی تھی۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ انشا اپنے اس پرانے رفیق کی پگڑی اچھالنے لگے۔ یہ ہنگامہ معرکۂ انشا و مصحفی کے نام سے مشہور ہے۔ ان مختصر اوراق میں اس واقعے کی تفصیل تو ممکن نہیں لیکن مختصراً اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ایک بار مصحفی نے ایک غزل پڑھی:-

"سرِ مشک کا تیرا ہے تو کافور کی گردن"

انشا نے اس پر بے شمار اعتراضات کیے اور اس کے جواب میں ایک غزل کہی:-

"توڑوں گا سرِ بادۂ انگور کی گردن"

کچھ دنوں بعد معاملہ رفت و گزشت ہو گیا۔ مصحفی نے پھر ایک غزل کہی "تابوت میں انگلی" "ہاروت میں انگلی" انشا کی ہنگامہ پسند طبیعت انھیں کب نچلا بیٹھنے دیتی تھی۔ انھوں نے بھی اس زمین میں اپنے مخصوص رنگ میں طبع آزمائی کی اور مقطع کو الٹ کر

یوں کردیا:-

تھا مصحفی کا ناچ چھپانے کو بس ازمرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

پھر کیا تھا دونوں طرف سے حملے ہونے لگے مصحفی بھی اپنے شاگردوں کی فوج کو لے کر میدان میں آگئے - انشا نے ایک غضب اور کیا کہ ایک سوانگ نکال دیا جس میں لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے اور گڈے اور گڑیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں جنھیں وہ آپس میں لڑاتے جاتے تھے اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے -

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

یہ سوانگ دیکھ کر مصحفی کے شاگرد آمادۂ پیکار ہوئے لیکن استاد نے روک دیا۔ آخر معاملہ نواب وزیر (آصف الدولہ) تک پہنچا اور انھوں نے انشا کو شہر بدر کردیا۔

اس کے بعد مصحفی کی زندگی کے باقی دن لکھنؤ میں بسر ہوئے لیکن افلاس اور تنگ دستی سے پیچھا نہ چھوٹا - کلام میں جگہ جگہ اس کا ذکر موجود ہے:-

بے زری کہتے ہیں جس کو مصحفی
کوئی بیماری سے بیماری ہے یہ

ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے
کیا پوچھو ہو اس بے سروساماں کے اوقات

اے مصحفی شکوہ نہ کریں روزی کم کا
یوں چاہیے اب ہم کو کہ اوقات گزاریں

اس زمانے میں امیروں کی خود یہ حالت تھی کہ "دیکھیے بیکار ہیں سرد پڑے ہیں اجاغ" لہٰذا تنخواہ ملنے میں باقاعدگی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ہے یہ بھی نوکری کچھ مصحفی کہ یاں تنخواہ
گر ایک سال ملے ایک سال میں ڈوبے

چوتھے دیوان میں مہدی علی خاں کی شکایت میں کہتے ہیں:-

بارہ سے دو غایب ہوئے دہ ماہ کی ٹھہری
فاقوں سے لگے مرنے تو تنخواہ کی ٹھہری
اب دلیوے ہے یاں کون مہینے کے مہینے
تقسیم یہی بس گہ و بیگاہ کی ٹھہری
جس دن سے ہوئے مہدی علی خاں کے حوالے
اس دن سے جدا نالۂ جانکاہ کی ٹھہری
اب چھاؤنی گویا کہ ہے اک تعزیہ خانہ
نالے کی ادھر سے تو ادھر آہ کی ٹھہری
لشکر کا وہ جانا ہے، نہ وہ جی کا جلانا
ٹھہری بھی سواری تو سر راہ کی ٹھہری
تھا فکر میں ان کی بھی تفضل تو ولیکن
غم کھا کے یہ فوج آصف جمجاہ کی ٹھہری
فراش جو پاتا ہے سو پاتے ہیں چڑھیتے
گھوڑوں کی تو کیا نوکری خرگاہ کی ٹھہری
جب بٹ چکی تنخواہ رسالے کی یہ ذلت
تب پیچھے کہیں بندۂ درگاہ کی ٹھہری

اے مصحفی یہ فرق کہاں اور کہاں میں
کیا کیجے جو یوں قسمتِ کوتاہ کی ٹھہری

۱۲۴۰ہجری میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے ستم دیکھیے کہ اس نامور شاعر کا مزار کس جگہ ہے یہ آج تک بھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

ہرگز نہ مصحفی کا رہا خاک بھی نشاں
حرفِ غلط کی طرح زمانے سے مٹ گیا

جتنے شاگرد مصحفی کو نصیب ہوئے اتنے کسی اور استاد کو میسر نہ آسکے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد سوا سو کے قریب ہے جن میں آتش جیسے نامور استادِ فن شامل ہیں اور ان کا فیض آج تک جاری ہے۔ بڑے بڑے تنقید نگاروں اور جلیل القدر شاعروں نے مصحفی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن میں سے کچھ مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و لطفِ بیاں کی رونق
—— حسرت

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے
—— حالی

قدرداں چاہیے، دیوان ہمارا ہے امیر
منتخب مصحفی و میر کے دیوانوں کا
—— امیر مینائی

کیونکر میں نہ ہوں اسیر خوش گو
تقلید یہاں ہے مصحفی کی
—— اسیر

یہ کلام، ایسا کلام، اتنا کلام!
ہے نشانِ مصحفی شانِ اسیر
—— داغ

افکارِ مصحفی ہیں کراماتِ مصحفی
چمکے بیاں سے اور نفاستِ مصحفی
—— جلیل

مصحفی کی طرز پا اخگر غزل کہتا ہوں میں
کام کچھ ہرگز نہیں مجھ کو عوام الناس سے
—— اخگر

اس سخن کا جلیل کیا کہنا
مصحفی کی زبان ہے گویا
—— جلیل

کچھ کچھ ہے ریاض میر کا رنگ
کچھ شان ہے ہم میں مصحفی کی
—— ریاض

سنگلاخ اتنا زمینِ شعر کو مت کر نحیف
چل جنابِ مصحفی کے پیچھے اس میدان میں
—— نحیف

میر و قتیل و مصحفی و جرأت و مکیں
ہیں یہ جو شاعروں میں نمودار چار پانچ ....
—— انشا

اب قدیم تذکروں وغیرہ سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں ۔

" پیشِ بلند رتبہ شاعریش اوجِ فلک بمنزلہ پستیِ زمین است و سلک گہر بارش رونقِ عقدِ ثریا و خوشۂ

پروین کلیم طور سینائے سخندانی و تجلی گاہ گرم کن وجود
ان معانی بودہ، تو استفادہ کمال از ہمچو خورشید
سراپا ضیا ہر سحبہ کس یافتہ ـــــ "

احمد حسین سحر تذکرہ بہار بے خزاں
(قلمی: ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"خدا مصحفی کی روح کو چین رکھے کہ شاعری کو چمن کر گئے اور لکھنؤ کو شاعرستان۔ لکھنؤ والوں کو بلبل ہزار داستان بنا گئے۔ آٹھ دیوان اردو کے ان سے یادگار ہیں جو شاعری کی تمام اصناف سخن سے مملو ہیں اور انتخاب میر کی طرح انتخاب کے سزاوار ہیں۔ خدا کسی کو توفیق دے۔"

(عبدالشکور شیدا
بیاض سخن ص۲۵)

"مصحفی کی استادی کو دیکھو اور پھر ان کی گمنامی کو۔ اعتراض ہوگا کہ مصحفی کی گمنامی کا دعویٰ غلط ہے۔ بندہ کہتا ہے کہ نام کی شہرت کا میں قایل نہیں۔ کہیں ان کا کلام چھپا ہو تو دکھلاؤ۔"

(خازن الشعرا)

"سچ تو یہ ہے کہ میر و مرزا کے سوا کوئی استاد مصحفی کے علاوہ میری نظروں میں نہیں جچتا۔"

(حسرت)

"یہ شخص وہ ہے جس کا احسان شعرائے اردو کو بھولنا نہ چاہیے۔ اللہ اللہ ایسا فیض بھی کسی کو ملتا ہے۔ یہ وہی ہیں کہ آج ہندوستان کی شاعری ان کو اپنا قبلہ و کعبہ جانے تو بجا ہے اور شعرا ان کو اپنا دستگیر! اس وقت جتنے شعرا ہیں مصحفی کے حلقہ دستگیری سے باہر نہیں۔ لوگ دلی و لکھنؤ لکھنؤ کیے جاتے ہیں۔ ذرا اس لطف خداداد کو دیکھیں کہ امروہہ کے رہنے والے تھے دلی اور لکھنؤ میں پہنچ کر کیا کیا کس نے ان کے آستانہ فیض نشانہ پر سر تعظیم نہیں جھکایا۔"

(صفیر بلگرامی: جلوۂ خضر ۱۵۵)

مصحفی کو بجا طور پر انگریزی کے شاعر کیٹس Keats سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ کیٹس کی طرح وہ بھی لسانیاتی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔

اللہ رے تیرے جامۂ گل رنگ کی مہک
جس کی لپٹ سے ہووے شمیم گلاب خوار

چھینٹیں دامن پر ہیں کچھ کچھ ہاتھ کچھ رخسار سرخ
ہے یہ کس بیتاب کے خوں سے تری تلوار سرخ

یہ کس سے کھیلی ہے ہولی صنم کہ آتے ہو
تم آج رنگ عبیر و گلال میں ڈوبے

پڑنے بال بھیگے ہوئے جب کمر پہ
وہیں برق ہنسنے لگی ابر تر پہ

مصحفی کی پرگوئی نے ان کے کلام میں رطب و یابس پیدا کر دیا لیکن اس سے اردو کو ایک خاص فائدہ پہنچا اور اس میں روانی پیدا ہو گئی۔ ان کی

زبان پر آغا کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ بابا ان
کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :-

زندگی میں تو عیادت کو نہ آئے اک دم
بعد مرنے کے مرے تم نے کیا ماتم تو کیا

نے نامہ ، نے پیام ، نہ قاصد ہے آفریں
تم نے تو اک قلم ہمیں جی سے بھلا دیا

اب تو چھپے پھرد ہو ، تب کیا کرو گے مشفق
جب روزِ حشر ہوں گے سَو داد خواہ پیدا

جانے کا پتا اپنے بتاتے ہو کہیں اور
یہ طرفہ تماشا ہے کہ جاتے ہو کہیں اور
ہنگامِ سحر آؤ ہو ، کر میرا بہانا
جا آخرِ شب فتنے جگاتے ہو کہیں اور

بہارِ زیست فرصت ہے شرر کی
کرے کیا کیا کوئی اس عمرِ کم پر

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

کبھو تک کو در کے کھڑے رہے ، نہ بھوت صبر کر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی ادا لے گئی جی کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی جی کو
یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ وہاں زلفِ دوتا لے گئی جی کو

بقیہ میر صفحہ ۳۶ کا

وہ جو نکلا صبح جیسے آفتاب
رشک سے گل پھول مرجھائے بہت
میں جو پوچھا میر سے عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

محمد اشرف، دہم۔ اے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا کی ولادت ۱۷۹۷ء میں آگرے میں ہوئی۔ ابھی دنیا کی پانچ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ چچا نے پرورش کا بار اٹھایا۔ مگر ابھی عمر کے دس سال مکمل نہ ہوئے تھے کہ چچا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آگرے میں مرزا نے نظیر اکبر آبادی سے تعلیم حاصل کی۔ تیرہ سال کی عمر تھی کہ دہلی میں شادی ہو گئی اور مرزا نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ دربار دہلی سے تعلق پیدا کیا اور آسائش سے گزرنے لگی لیکن ۱۸۵۷ء میں جب آزادی کی پہلی تحریک شروع ہوئی تو مرزا معتوبین کی فہرست میں شامل ہوئے اور انقلابیوں کی مدد کے شبہ میں پنشن بند کر دی گئی جو بعد از خرابیِ بسیار جاری ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے لرزہ خیز واقعات خود مرزا نے اپنی آنکھوں سے دیکھے بلکہ خود نشانہ بھی بنے بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر ذوق کا کہا ہوا سکہ ان کے نام سے منسوب ہوا۔ اور صفائی پیش کرنی مشکل ہو گئی مرزا کو ایک انگریز حاکم نے طلب کر کے پوچھا "مرزا سنا ہے تم بھی باغی مسلمانوں میں شامل تھے" مرزا کی حاضر جوابی اور شوخی کام کر گئی۔ بولے "میں تو مسلمان ہی آدھا ہوں باغی کس طرح ہو سکتا ہوں" پوچھا "وہ کیسے" مرزا نے کہا "شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا"

غالب کی ہمہ گیر شخصیت کی مکمل جلوہ گری ان کے خطوط میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خطوں سے انسانی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ نجی خطوں میں شخصیت بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ فکر و نظر اور ذہن و مزاج کی حقیقتوں پر جو پردے پڑے ہیں۔ خطوں میں وہ سب اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب کے مکاتیب اس مقولے کی مکمل تشریح ہیں۔

غالب کے خطوط صرف ان کی شخصیت اور ذاتی حالات کا آئینہ خانہ نہیں ہیں۔ ان میں غدر کے زمانے مختلف واقعات و حادثات کا بھی تذکرہ ہے یہ خطوط ان کی زندگی کا مرقع بھی ہیں اور اس دور کے حوادث و حالات کا روزنامچہ بھی۔ بغرض ۱۸۵۷ء کی قیادت خود مرزا پر گزری تھی۔ ان کے خطوط ان کے واقعات کی سچی کہانیاں ہیں۔ اس

[illegible] کو ماؤف کر دیا۔ تفتہ
کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔
"میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ
شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے
اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے
ہندی کلام میں ڈیڑھ شعر
یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد
رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل الٹنے
لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع
زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ
آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا
ہوں۔ ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور
تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو
ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس
بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ
انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ
کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس
میں کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار
اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں
میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد،
کچھ معشوق سو وہ سب کے سب
خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم
کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں
کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کہ
نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے
کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے
والا بھی نہ ہوگا۔"

مرزا پہلے اسد تخلص کرتے تھے لیکن اسی تخلص کے ایک اور بزرگ تھے۔ ان کے اشعار مرزا کے نام سے منسوب ہونے لگے۔ ایک دوست نے لکھا کہ آپ کی وہ غزل بہت پسند آئی جس کا مقطع ہے:-

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

انھیں بڑا ناگوار گزرا اور لکھا کہ اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت اور اگر کسی اور کا ہو تو اس پر ہزار رحمت۔ اس دن سے غالب تخلص اختیار کیا۔

قلعے میں رسائی کے بعد استاد شہ، ذوق سے اکثر چوٹیں رہتی تھیں۔ مرزا نے قلعے میں ایک سہرا پڑھا اس کے آخر میں یہ دعویٰ تھا۔ "دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا" ذوق غالب کی تعلی کو کب برداشت کر سکتے تھے انھوں نے فوراً جواب میں سہرا کہا اور بادشاہ کے کان الگ بھرے۔ غالب کو صفائی کرتے بنی۔ ایک غزل میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے:-

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالب بڑے حاضر جواب اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے ان کے دم سے دوستوں کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ آموں کے بے حد شوقین تھے اور آموں کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ "میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں"۔ بہت سے پرخاص زور تھا۔ ایک بار بے تکلف دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے۔ ایک گدھا ادھر سے گزرا۔ آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انھیں سونگھا اور گزر گیا۔ ایک دوست بولے "دیکھو مرزا! گدھے بھی آم نہیں کھاتے"۔ یہ کب چوکنے والے تھے فوراً بولے "ہاں گدھے آم نہیں کھاتے"۔

ایک بار قلعے سے تنخواہ ملی تو سب کی شراب خریدلی کسی نے پوچھا "یہ کیا؟" بولے "قرآن شریف میں جگہ جگہ خدا نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے شراب کا نہیں ہے۔ اس لئے شراب خریدلی کہ روپے نہ ہونگے تو یہ کہاں سے ملے گی" یہ بات بادشاہ تک پہنچی، بہت لطف اندوز ہوئے اور قلعے وغیرہ کا بندوبست کرا دیا واقعی اللہ میاں نے جو وعدہ کیا تھا ہے وہ پورا کردیا۔

ایک صاحب نے خط میں شکایت کی کہ "مرزا جی! سنا ہے آپ روزے نہیں رکھتے۔ آپ کیسے مسلمان ہیں؟" مرزا نے جواب دیا "میاں تم نے غلط سنا ہے۔ کس نے کہہ دیا میں روزے نہیں رکھتا۔ سخت گرمی پڑ رہی ہے مگر روزے رکھتا ہوں۔ ہاں بیچ بیچ میں روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی روٹی کا ٹکڑا کھا لیا کبھی ایک کٹورا پانی پی لیا۔ کبھی حقے کا ایک کش لگا لیا"۔

مرزا کا ایک ایک لطیفہ ایسا ہے کہ بار بار پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ بقول حالی "مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں"۔

مرزا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ فارسی اور اردو کے اساتذہ کا کلام ذہن میں محفوظ تھا۔ ایک خط میں لکھا ہے "کہ کتاب کے نام کو تو میرے پاس دو ورق بھی نہیں۔ ایک پھیری والا کتابیں بیچتا ہوا آتا ہے اس سے طرح طرح کے رشتے جوڑتا ہوں اور کتاب لے کر رکھ لیتا ہوں۔ پڑھی اور لوٹا دی" لیکن پڑھتے اس طرح تھے کہ جو کچھ پڑھا ذہن میں نقش ہوگیا۔ اللہ ایسا ذہن اور حافظہ ہم سب طالب علموں کو دے آمین۔ غالب ایک بہت رحمدل انسان تھے ان پر کیسی ہی بیت رہی ہو لیکن ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

بحیثیت شاعر کے مرزا کو جو مقام حاصل تھا وہ کسی اور شاعر کو نہ ہو سکا۔ ان سے پہلے اردو شاعری عاشقوں کی وفاؤں اور حسینوں کی جفاؤں کے قصوں تک محدود تھی۔ غالب نے اردو غزل کو بلند آہنگی عطا فرمائی اور تنگنائے غزل کو نئے مضامین داخل کر کے وسیع بنایا۔ مثال کے طور پر یہ غزل ملاحظہ ہو۔ اس میں زندگی کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ابتدا میں غالب بیدل کے رنگ میں خیالی مضامین لکھتے رہے اور لوگ انھیں مہمل گو کہتے رہے اور مشکل گوئی کی شکایت کرتے رہے ؎

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس پر غالب نے کہا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

مشکل گوئی کے سبب غالب کے کلام کی خاطر خواہ داد نہ ملتی تھی اور اس پر وہ اکثر افسردہ رہتے تھے۔ یہ تلخی اکثر شعروں میں نمایاں ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بقیہ درد صفحہ ۶۱ کا

بے طرح کچھ الجھ گیا تھا دل
بے وفائی نے میری سلجھایا

تھا عالمِ جبر کیا بتادیں
کس طور سے زیست کر گئے ہم

ان دنوں کچھ عجب ہے حال مرا
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے
معلوم نہیں کدھر گئے ہم

حکیم مومن خاں مومن

محمد مومن خاں نام اور مومن تخلص، ۱۲۱۵ھ میں دہلی کے کوچہ چیلان (جس کا اصلی نام چہل امیران ہے) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کو شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بہت زیادہ عقیدت تھی، چنانچہ وہ ان کو گھر لے آئے۔ شاہ صاحب نے بچّے کے کان میں اذان کہی اور محمد مومن نام رکھا۔ ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا جو ایک مشہور طبیب تھے، اور دہلی کے شرفا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مومن نسلاً کشمیری تھے۔ ان کے دادا مغلوں کے آخر دور میں کشمیر سے دہلی آئے۔ اور شاہی دربار کے طبیبوں میں شامل ہوئے۔ بڑے ہوکر مومن نے بھی اپنے چچا غلام حیدر خاں سے طب پڑھی اور اس فن میں مہارت حاصل کی۔ انھوں نے کافی عرصے تک اپنے چچا کے مطب میں نسخہ نویسی کی لیکن طبابت کو پیشے کے طور پر کبھی اختیار نہیں کیا۔ عربی کی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ فنِ رمل، جفر نجوم، ریاضی اور موسیقی میں بھی ان کو کافی مہارت حاصل تھی۔ لیکن سب سے زیادہ لگاؤ شاعری سے تھا۔ چنانچہ یہ ان کے تمام کمالات پر غالب آگئی۔ اس لیے بحیثیت شاعر کے وہ سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ مومن کی جو قلمی تصویر مرزا فرحت اللہ بیگ نے کھینچی ہے اسے یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

"کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈے، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوتے کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی مل کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ تاگا

نیچے ایک چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے پلو ان کے سامنے پڑے ہوتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت۔ پاؤں میں سرخ گل بدن کا پاجامہ۔ مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی ہوتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر اچھی طرح منڈھا آگئی تھی۔ اندر سے ململ کے کرتے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

مومن ایک شاعر ہی نہیں عظیم انسان بھی تھے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں کو بڑی خوب صورتی سے برتا۔ لیکن وہ ہمیشہ ایک شاعر ہی رہے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ انسان تھے اور انھیں انسانی اقدار سے دلچسپی تھی۔ مومن، زندگی اور اس کی دل آویزیوں اور مسرتوں کے شیدائی تھے۔ انھوں نے کبھی اس احساس کا گلا نہیں گھونٹا۔ وہ زندگی کا ایک معیار رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی زندگی میں کبھی کبھی بے راہ روی کو دخل ہو گیا۔ ایک خاص سطح سے انھوں نے اپنے آپ کو کبھی پیچھے نہیں گرایا۔ انھوں نے کبھی کسی کے ماتحت رہنا پسند نہیں کیا۔ کسی کے دربار تک نہیں گئے۔ کیونکہ اس سے انفرادیت مجروح ہوتی تھی۔ انسانی اقدار کا خون ہوتا تھا۔ اس کی سب سے اچھی مثال وہ تین اشعار ہیں جو انھوں نے نواب وزیر الدولہ بہادر والیِ ٹونک کے بلانے پر بطور معذرت لکھ بھیجے تھے ؎

یادِ ایّامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی — ورنہ میں اور تیری مہمانی
ہے ابھی آرزوئے وصلِ صنم — ہے ابھی حسرتِ ہوس رانی

آرزوئے وصلِ صنم اور حسرتِ ہوس رانی سے یہاں زندگی کے ساتھ والہانہ شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مومن تو بس اسی کے شیدائی تھے۔ پھر بھلا ان سے درباری ماحول کی گھٹن کس طرح برداشت ہو سکتی تھی۔ مومن کا محورِ شاعری حسن و عشق اور اس کے مختلف معاملات، مسائل، متنوع واردات و کیفیات ہے، انھوں نے خود اس کوچے میں قدم رکھا ہے۔ اس لیے وہ اس کے ان گنت پہلوؤں

کا شعور رکھتے ہیں۔

مومن نے اپنی غزلوں میں اس کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اس حُسن کو جسم میں دیکھا ہے رنگت، چال ڈھال اور آواز میں دیکھا ہے۔ غرض کوئی چیز ان کی نظر سے بچی نہیں رہتی۔ وہ اس کے گرویدہ رہے ہیں اور اس کی تصویر اس طرح خوب صورتی سے کھینچی ہے کہ خود اس تصویر کے حسن کا جواب نہیں۔ اس میں کچھ تو حسن کے اس پہلو کو دخل ہے جو مومن پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور کچھ ان کی رنگین اور پُرکار تخیل بھی اس میں حُسن کی بجلیاں بھر دیتا ہے۔ اس لیے مومن کی پیش کی ہوئی یہ تصویریں منہ سے بولتی دکھائی دیتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

کیا جلوے یاد آتے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

پھر پیرہن کے چھوٹتے ہیں کرشمے برنگِ گل
پھر مجھکو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

پھر دل ہے داغ مطلعِ خورشید دیکھکر
از بسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

چلتا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرزِ خرام و شوخیِ رفتار کے لیے

اُس بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے
کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا
آنکھیں جو کہہ رہی ہیں وہ لب سے بیاں نہ ہو

نکہت اس زلف کی صبا میں نہ ہو
اُڑ گیا رنگِ بوئے سنبل کا

[illegible] ہر آن ہے دیکھ   شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عشق کے موضوعات کی ترجمانی کرتے ہوئے جو فضا مومن کی غزلوں میں چھائی رہتی ہے۔ وہ جولانی، مسرت کی فضا ہے۔ اس میں قدم قدم پر ایک نشاطیہ آہنگ ہوتا ہے۔ مومن کھل کر کھیلتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کی طرف راغب نہیں اور نہ ہی ہاتھا پائی سے دلچسپی معلوم معلوم ہوتی ہے، لیکن زندگی کی فطری مسرتوں سے وہ سینہ بھرنے کے لیے ضرور تیار رہتے ہیں اس سلسلے میں انھیں ان تمام منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جن سے جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند انسان کو گذرنا چاہیے۔ مومن کی غزلیں انسان کی اس فطری رجحان کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ ان اشعار کو دیکھیے انسان کی اس رنگین، دلآویز و پُر کیف دنیا کے کیسے کیسے لطیف پہلو ہیں۔ جو ان میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں ؎

بات شب کو اس سے منع بیقراری پر بڑھی   ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں   تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

آنکھیں جو ڈھونڈتی تھیں نگہ ہائے التفات   گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

بوئے گل لائے نسیمِ صبح اب کس کو دماغ   ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن برسات کو

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کے اس کلام میں انداز بیان کا ایک فطری آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی دلچسپی کبھی بھی کم نہیں ہو سکتی۔ مومن کی غزلیات کے علاوہ مخمس و مسدس اور قصیدوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ان میں بھی ایک مخصوص انفرادیت ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

مومن کی اس مخصوص انفرادیت ہی نے انھیں ایک اچھا شاعر بنایا۔ ان کے پیش کیے ہوئے موضوعات میں کوئی خاص گہرائی نہیں۔ تفکر ان کے یہاں نام کو بھی نہیں ملتا۔ وہ تو صرف محسوسات کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں مفکرانہ گہرائی اور فلسفیانہ عظمت کو تلاش کرنا بیکار سی بات ہے۔ مومن کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انھوں نے فکر و فلسفہ کا سہارا لیے بغیر صرف محسوسات ہی کے بیان میں وہ کمالات دکھائے کہ ان کی شاعری نے فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا۔ مومن کی انفرادیت اسی میں نظر آتی ہے۔ اور اسی لیے اردو شاعری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا کوئی ثانی نہیں۔

انتخاب کلام

پاؤں زنداں سے اُٹھے کیا سر اُٹھا سکتے نہیں حلقۂ زنجیر آخر طوق گردن ہو گیا

بندگی کام تو دی آخر میں نہ کہتا تھا کیوں سلام میرا

ذکرِ شراب و حور کلام خدا میں دیکھ مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

دن رات فکر جور میں یوں رنج اُٹھانا کب تک میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

روزِ جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

کیا خوش ہوئے دیکھ آئینہ کو / کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
آئینۂ زنگِ غم نے توڑا / کیونکر اسے منہ دکھائیں گے ہم

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجرِ یار کی / آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے / ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا / جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں / اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے / مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں / آسمان کے ستم اٹھانے کو

جاتے تھے صبح رہ گئے بیتاب دیکھ کر / طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھ کر
پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار / آنکھیں چراتے ہیں مجھے احباب دیکھ کر
یہ تشنہ کامیٔ نگہِ گرم دیکھنا / حیرت سے رو دیا طرفِ آب دیکھ کر
مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو / کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

یاد اس کی گرمیٔ صحبت دکھاتی ہے بہار / آتشِ گل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار
کھل چکی نرگس کہ شرماتی ہی جاتی ہے بہار / دیکھ کر اس کی بہار آنکھیں چراتی ہے بہار
آمد آمد ہے چمن میں کس سخن اندام کی / سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

محو حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں   بلبل تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار
غنچہ ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں   خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

اعجاز جاں وہی ہے ہمارے کلام کو   زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو   بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
اس سے جلا کے غیر کو امید پختگی   لگ جائے آگ دل کے خیالات خام کو

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
ہوئے آغاز الفت میں ہم افسوس   اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی
کیا جب التفات اس نے ذرا سا   پڑی ہم کو حصول مدعا کی

بہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے   جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے
شب وصل آپ کا عذر نزاکت   بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر آپ   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
خدا کی بے نیازی ہائے مومن!   ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے   وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
اندیشۂ مژگاں میں اگر خوں نے کیا جوش   نشتر سے علاج دل دیوانہ کریں گے
گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو   پرہیز کریں گے یہ مداوا نہ کریں گے
پھر جائے نہ تا چشم صنم آنکھ کے آگے   سیر چمن نرگس شہلا نہ کریں گے
گر حسن گلہ سوز نے پھر آگ لگائی   کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کریں گے
لیکن جو بتوں ہی نے بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

صبر نا صبر فرسائی سے کیا ہوتا ہے — دیکھا ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے
اک نظر دیکھے سے سرتن سے جدا ہوتا ہے — بے جگہ آنکھ لڑی دیکھئے کیا ہوتا ہے
چشمِ خونبار مری آپ نے تلووں سے ملی — ورنہ ایسا بھی کہیں رنگِ حنا ہوتا ہے
دل دیا جس نے وہ ناکام "تا دمِ زیست — فی الحقیقت کہ بُرا کام بُرا ہوتا ہے
ہو نہ بیتاب غمِ ہجرِ بتاں میں مومن ! — دیکھ دو دن میں یہ اب فضلِ خدا ہوتا ہے

مجھے یاد آ گئی بس وہیں اس کے قد و قامت کی — چمن میں دیکھ کر کل سرو میں نے کیا قیامت کی
دیا ظالم کو دل جاں غیر کو آرام وحشت کو — کسی کا شکوہ کیا کیجئے یہ خوبی اپنی قسمت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اُس نے — سزا ہے اے دلِ ناداں اُس الفت اُس محبت کی
گلہ کیا کیجئے اس بدگمان عیّار پُر فن کا ! — کہ عرضِ حال سے جس کو شکایت ہو شکایت کی

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے — دوستی تم کو نہیں اغیار سے
کچھ نہ سوجھا حسرتِ دیدار سے — سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے
داغ خوں سے میرے وہ حیران ہوا — دامن اُلجھا ہے گلِ بے خار سے
ہائے کم بختِ خفتہ کی یوں جھپکی آنکھ — دشمنوں کے طالع بیدار سے
کہہ غزل اک اور بھی مومن کہ ہے — شوق اس بت کو ترے اشعار سے

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آ جائے
نام بدبختیِ عشاق خواں ہے بُلبُل — تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آ جائے
کلفتِ ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں — دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آ جائے
محو دلدار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمن جاں — مجھ پہ جب ناصح بیدرد کو پیار آ جائے
ٹھہر جا جوشِ تپش ہے تو تڑپتا لیکن ! — چارہ سازوں میں ذرا دمِ دلِ آنا آ جائے

حسنِ انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو ما   جائے

اسرار حسین ، ایم۔ اے

ذوق کا اردو شاعری پر احسان

اگر ادب کسی معاشرت کا آئینہ دار اور اس کا رہبر ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ عام فہم ہو، آسان ہو چند اشخاص کی فکر کا مظہر ہونے کے بجائے ہر شخص کے دل کی بات ہو۔ تاریخ زبان سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھنے والا، ہر کوئی فرد جانتا ہے کہ پورے معاشرے نے کسی بھی زبان کو اس وقت تک اپنائے رکھا جب تک وہ زبان عوامی رہی۔ جب جب بھی زبان محض چند افراد کی باندی بنی عوام سے اس کا رشتہ کٹ گیا۔ یہی اصول کسی بھی زبان کے ادب میں کارفرما طاقت ہوتا ہے۔ اسی اصول کو اپنا کر کسی بھی زبان کا ادب پھولتا پھلتا ہے اور دوامی بنتا جاتا ہے۔ ناممکن ہے کہ اس اصول کو اپنائے بغیر کسی زبان کے شاعر و ادیب اُس زبان کے شعر و ادب کو فروغ دے سکیں۔ خوش قسمتی سے اردو کے ساتھ ایک حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا۔ اگر ایک طرف غالب کی تخیلی بلندی۔ مومن کی معنوی و لفظی تاریکی ناسخ کی لغوی معنی آفرینی اور آتش کی جذبات کی فراوانی نے اردو شاعری کو بلندیٔ خیال، نکتہ آفرینی، معنوی گہرائی اور جذبات کی آئینہ داری کے سلیقہ سے نوازا۔

تو دوسری طرف لاشعوری طور پر عوام اور بالفاظ دیگر معاشرے سے اس کے قطع تعلق کا سامان فراہم کیا مگر حسن اتفاق سے ذوق کی شاعری اس المیہ کے واقع ہونے میں مانع ہوئی۔ انھوں نے اردو زبان کو چند افراد کے الجھے ہوئے افکار اور وقتی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بننے سے بچایا ورنہ اردو اپنی موجودہ شکل میں نہ ہونے کے سبب سنسکرت کے انجام کو پہنچ چکی ہوتی۔ ذوق نے قصیدے کی صنف کو عروج کی ایسی بلندیوں تک پہنچایا کہ اس سے زیادہ بلند مقام پر اس صنف شعری کو لے جانے کا خیال دیوانے کا خواب تو ہو سکتا ہے مگر شرمندۂ حقیقت نہیں۔

چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

فرط ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

ابرِ تر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

دیکھئے کتنے سیدھے سادے انداز میں عام فہم اور اچھوتے اسلوب میں کیسی دقیق حقیقتوں اور نفسیاتی نکتوں کو شعر کا لطیف و حسین جامہ پہنایا ہے۔ کسی بھی شعر کو سمجھنے میں دقیقہ سنجی اور اعلیٰ دماغی درکار نہیں ہے اور لطف یہ ہے۔ اثر آفرینی، حفظ ذہنی اور شاعرانہ لطافت اپنی جگہ برقرار ہے۔

شستہ اور برجستہ لفظوں اور ترکیبوں سے ان کا خزانہ بھرا پڑا تھا۔ ان کے نامور شاگرد نے درست ہی لکھا ہے کہ "باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا شربت کا ایک گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے پلا دیا۔"

غالب کی فلسفیانہ بلند آہنگی اور مومن کی معنی آفرینی کے آگے ذوق کی سادگی نے اس زمانے کے سخن فہموں کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ذوق کو غالب کی عظمت اور مومن کا مرتبہ حاصل نہ ہوا۔ آزاد شاگردی کے جوش میں خود پر قابو نہ رکھ سکے اور ذوق کا مرتبہ متعین کرنے میں ناکام رہے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ عقیدت کے جوش نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ ذوق چیچک رو تھے لیکن شاگرد کی محبت دیکھیے لکھتے ہیں کہ یہ داغ کچھ ایسی موزونیت سے واقع ہوئے تھے کہ بہار دیتے تھے اور حسن میں اضافہ کرتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ ذوق کا یہ شعر سن کر کہ:

خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

مومن خاموش ہو رہے کیونکہ وہ اس پائے کا شعر نہیں کہہ سکتے تھے، ان کی جانب داری کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

آزاد کا یہ بیان کہ سن رسیدہ بزرگ معروف ان سے اصلاح لیتے تھے درست نہیں معلوم ہوتا اور ان کا ظفر پر یہ الزام کہ ان کی غزلیں

ذوق کو کر دیتے تھے اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ بحیثیت انسان ہم ذوق کی عظمت کے قائل ہیں۔ خدا نے انھیں قناعت کا بیش بہا خزانہ عطا فرمایا تھا معمولی تنخواہ پر ظفر کے اتالیق کی خدمت انجام دیتے رہے اور کبھی زبان کو شکوے شکایت سے آلودہ نہ کیا۔ حقوق العباد کا خیال رکھتے تھے بڑے خدا ترس اور دیندار تھے۔ قسمت ایسی پائی تھی کہ زندہ رہے تو استاد شہ ہونے کا فخر حاصل رہا، مرے تو ان کے لائق شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھ کر امر کر دیا۔

نمونۂ کلام :-

لکھیے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورت تصویر نہالی
کیا اٹھے سر بستر غم اٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو رخت سفر بھی
اے راہرو ملک عدم! اٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دست کرم اٹھ نہیں سکتا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار
پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق! وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

اب ذرا دوسرا رنگ ملاحظہ ہو :-

کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دنیا جنس ہے ساری اکٹھی
میٹھی چاہے میٹھی لے لے، کھٹی چاہے کھٹی
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

روپ رنگ پر بھول نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری
اوپر میٹھی، نیچے کھٹی، انبوا کی سی کیری
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

چند اور شعر ملاحظہ فرمائیے :-

کیسا مومن کیسا کافر، کون ہے صوفی، کیسا رند
سارے شر ہیں، بندے حق کے، سارے شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اس کے سو سو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اس سے جھگڑتے ہیں، حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دل میں رہوں میں، جلوۂ جاناں کہتا ہے میں
کس کو نکالوں کس کو رکھوں، یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں، نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں، شکوہ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

سید اعجاز احمد، یازدہم - بی

بہادر شاہ ظفرؔ اور اُن کی شاعری

تاریخ پیدائش :-

بہادر شاہ ظفرؔ کی ولادت ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو ہوئی۔ بچپن شہزادوں کی طرح لال قلعے میں گزرا۔ اور انھوں نے تمام مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ ولی عہد، برسہا برس رہے اور آخر جب ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی نے وفات پائی تو بہادر شاہ ظفرؔ جن کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی مسند نشین ہوئے۔ تخت نشینی کے بعد بہادر شاہ نے "زینت محل" سے شادی کی۔ ایک بچہ جس کا نام جواں بخت رکھا گیا پیدا ہوا۔

ولی عہدی کے جھگڑے :-

بہادر شاہ کی مسند نشینی کے ساتھ ہی بڑے لڑکے دارا بخت میراں شاہ کی ولی عہدی کا اعلان ہو چکا تھا۔ زینت محل جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتی تھی۔ بہادر شاہ زینت محل کی بات ٹال نہ سکتے تھے۔ لیکن مجبور تھے۔ کیونکہ منظور شدہ ولی عہدی کو ختم کرانے کی کوئی شکل نہ تھی۔

۱۸۴۹ء میں دارا بخت کا انتقال ہوا۔ جواں بخت کے لیے پھر کوششیں ہوئیں لیکن انگریز دوسرے بڑے بیٹوں کو چھوڑ کر چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسرے دارا بخت سے چھوٹے شہزادے میرزا فخر الدین کے تعلقات انگریزوں سے بڑے خوشگوار تھے۔ پھر ان کی بہت سی شرطیں بھی تھیں جو میرزا فخرو نے منظور کرلیں اور اس طرح ۱۸۵۲ء میں اس کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح بادشاہ کو ناکامی ہوئی اور اس کا افسوس ان کو تمام عمر رہا۔ میرزا فخرو کے انتقال کے بعد پھر جواں بخت کی ولی عہدی کے لیے کوششیں ہوئیں مگر ان میں بھی ناکامی ہوئی۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے بادشاہ کو نذریں دینا بند کر دیا۔ اور ان کی کوشش کے باوجود وظیفہ میں اضافہ نہ کیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دل میں انگریزوں کی طرف سے بہت ملال تھا۔ مگر بڑھاپے، کاہلی اور آرام طلبی

کی وجہ سے وہ کچھ کرنے سے بھی قاصر تھے۔

حلیہ :-

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ۱۸۵۷ء سے کم و بیش دس سال پہلے کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔

• میانہ قد۔ بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے بیچ کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی، لمبی گردن، جو کا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، چھدری داڑھی لبیں کتری ہوئی۔ بال سفید بھک، پھر بھی داڑھی میں اکا دُکا سیاہ بال، چہرے پر جھریاں۔

اوصاف :-

• "زینت محل" کے زیرِ اثر اگرچہ بادشاہ سے کچھ نازیبا حرکتیں بھی ہوئیں مگر اِن سے ان کے اوصاف حمیدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کی غریب پروری کا یہ عالم تھا کہ لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے، اپاہج، جتنے ملازم تھے سب کی تنخواہیں گھر پہنچوا دیتے تھے۔ اور ان کی خبریں قلعے میں جاتی تھیں عمر بھر میں شاید ہی کسی ملازم کو موقوف کیا ہو۔ ملازموں سے ہمیشہ نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے حالات :-

بادشاہ کو بارہ ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا جو ان کے اخراجات کے لئے ناکافی تھا وظیفہ بڑھانے کے لیے کئی مرتبہ کوشش کی گئی مگر انگریزوں نے وظیفہ نہ بڑھایا۔ عملی طور سے بادشاہ کی حکومت قلعے تک رہ گئی تھی قلعے سے باہر انگریزوں کی عملداری تھی جس سے بادشاہ کو سخت تکلیف تھی۔ اُسی زمانے میں میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت ہوئی اور فوجوں کے ساتھ عوام بھی شامل ہو گئے۔ اس طرح آزادی حاصل کرنے کے لیے پہلی جنگ کی ابتدا ہوئی۔ وہ چنگاری جو برسوں سے دبی ہوئی تھی یکایک شعلہ بن گئی۔ آزادی کے متوالوں نے اپنی قیادت کے لیے بہادر شاہ ظفر کو منتخب کیا۔ لیکن صرف عمر اور قوی میں ہی کمزور نہ تھے بلکہ ان کے پاس کوئی چیز بھی نہ تھی جو نظم و نسق چلانے میں معاون ہو سکتی نہ روپیہ تھا نہ ساز و سامانِ جنگ، نہ شہر میں بڑی فوج کے لیے رسد کا کوئی بندوبست تھا اور نہ سپاہیوں کی تنخواہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان حالات میں وہ زیادہ دیر کام نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض نے لوٹ مار میں بھی تامل نہ کیا اور کھانے پینے کی چیزیں تو عموماً زبردستی اٹھائی جانے لگیں۔ بعض کے پاس اتفاقات کی بنا پر بہت بڑی رقمیں جمع ہو گئیں۔ اور وہ نرخ سے زیادہ روپیہ دے کر اشرفیاں خریدنے لگے تاکہ ان کے رکھنے میں سہولیت رہے۔ بہر حال بادشاہ کی بے مائگی اور تہی دستی نے حالات اور زیادہ نازک بنا دیئے اور نظم و نسق خراب ہو گیا۔

اس کے برخلاف انگریزوں کی پوزیشن پہلے ہی مضبوط تھی۔ اور ان کے پاس کمک بھی پہنچ رہی تھی۔ ایسے حالات میں دہلی کو تسخیر کرنے کے لیے

بقیہ صفحہ ۹۷ پر

داغ دہلوی

نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد سمرقندی تھے۔ مرزا صاحب کے پردادا عارف جان جو ہندوستان آئے ان کے دو بھائی قاسم جان اور عالم جان تھے قاسم جان سب سے بڑے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں یہ لوگ ہندوستان آئے، شروع میں نواب معین الملک ناظم پنجاب کے مہمان ہوئے اور کچھ عرصے وہاں رہے پر منو کی وفات کے بعد ان لوگوں کو پنجاب چھوڑنا پڑا اور قاسم جان اپنے بھائیوں کے ساتھ ہندوستان پہنچے اور شاہزادہ عالی گہر کے رفقاء میں شامل ہو گئے یہی عالی گہر جب بادشاہ ہوئے اور شاہ عالم ثانی کہلائے تو قاسم جان کو شرف الدولہ خطاب ملا بادشاہ سے اتنا قرب حاصل تھا کہ ہمہ وقت معرکوں میں ساتھ رہا کرتے تھے۔ چنانچہ زمانۂ شاہزادگی میں کامل ۱۰-۱۱ سال قاسم جان شاہزادے کے ساتھ رہے، میر صادق سے جو معرکہ ہوا تھا وہ انھیں قاسم جان سے ہوا تھا۔ ان سب بھائیوں کا قیام دہلی کے جس محلے میں تھا وہ محلہ قاسم جان کے نام سے اب تک موجود ہے۔ اور اس وقت تک ان لوگوں کے مکانات موجود ہیں۔ قاسم جان کے منجھلے بھائی عارف جان بھی بڑے بہادر جفاکش انسان تھے انھیں کے لڑکے احمد بخش تھے۔ اور انھیں احمد بخش کے لڑکے شمس الدین خاں ہوئے جو داغ کے والد تھے۔

داغ کی زندگی کا بیشتر حصہ حسن و عشق کی رنگینیوں اور محبت و الفت کی سرگرمی سے ملوث ملے گا۔ داغ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ یقیناً دوسرے تمام شعراء کے حالات سے مختلف تھا۔ وہ ایک نواب خاندان سے وابستہ تھے۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک کا زمانہ رئیسوں اور بادشاہوں میں گزرا اور بڑی حد تک انھیں کے زیر سایہ تربیت و پرورش پائی۔ ۱۴ سال کی عمر میں رام پور سے دہلی آئے اور شاہی لطافت و کرام سے مالامال ہے۔

مرزا داغ نے تقریباً اپنی عمر کے بیس سال ایسی فضا میں بسر کئے جو یکسر حسن و نغمات کی فضا تھی چونکہ شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے لہذا جب شاعری شروع کی تو ان کی شاعری کا موضوع بھی رنگین تر ہی پایا گیا۔ ہندوستان میں داغ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے شاگرد کونے کونے میں

پھیلے ہوئے ہیں جن میں زیادہ تعداد ایسے شاگردوں کی ہے جو خط و کتابت کے ذریعے شاگرد ہوئے ہیں اور برس ہا برس وہ لوگ داغ سے اصلاح لیتے رہے۔ حضرت داغ کے شاگردوں میں بہت سے ایسے شاگرد بھی موجود ہیں جو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کر چکے ہیں۔ اکثر وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسے مخلص اور سعید شاگرد ملے۔ شاعروں پر ادبی چشمک زنی ہمیشہ رہی۔ لیکن ایک حد تک کو اس ادبی و شاعرانہ مخالفت کا اثر ان کے شاگردوں خراب کبھی نہیں پڑتا تھا اور اپنے استاد کے احباب کی ایک شاگرد کی حیثیت سے ہی قدر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان چشمک آرائیوں میں استاد (داغ) کا ہاتھ بٹائیں۔

مرزا داغ خوش خوراک تھے، دسترخوان پر ہمیشہ چار یا پانچ قسم کے کھانے ضرور ہوا کرتے تھے، سادہ قورمہ، قلیا اور کباب عام طور پر کھاتے تھے مرغ کے کبابوں کا اتنا شوق تھا کہ ایک دفعہ میں پورا ایک مرغ اڑا جاتے تھے۔ دو چار مہمان ہمیشہ دسترخوان پر موجود رہتے تھے۔ خاص خاص میووں سے بھی شوق تھا، انگور کی پیٹیاں کی پیٹیاں خالی کر دیا کرتے تھے۔ تیتر مرغ اور بٹیر ہر وقت موجود رہتے تھے اور دو چار کی گردن پر روز چھری پھرا کرتی تھی۔ سینکے بھٹے، مکا اور باجرہ بھی بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ تنہا کھانا کبھی نہیں کھاتے تھے اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تو کھانے وقت حاضر باشوں میں سے ہی کسی کو شریک کر لیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے میں بہت خوش ہوتے تھے جوانی عمر میں ورزش کا بہت شوق تھا مگر پھر لکھنے کی مشق بہت بڑھی ہوئی تھی۔ پتنگ بازی بھی دیکھتے رہتے تھے اور کبھی خود بھی پتنگ اڑایا کرتے تھے۔

داغ کی حیات میں کئی دفعہ ان کے انتقال کی بے بنیاد خبر اڑ گئی۔ ان کے شاگردوں نے خود داغ سے خط لکھ کر اس قسم کی غلط خبروں کی وجہ معلوم کرنا چاہی داغ نے ان کو یہ جواب لکھا۔

عمر کے دن گزرتے جاتے ہیں
جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں

اسی طرح اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں آپ نے میرے انتقال کی خبر سنی ہیں بھلا اس کو سچ سمجھتا ہوں ؎

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

اس کے آگے لکھتے ہیں۔ آپ نے تو ایک دفعہ میرے مرنے کی خبر سنی میں ہر سال سنتا ہوں اور اسی کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ جن لوگوں نے میرے زندہ ہونے کی تصدیق کی تھی وہ بے چارے خود چل بسے خدا ان کو جنت نصیب کرے اور مجھے بھی آپ کو بھی۔

داغ تنہائی سے بڑا گھبراتے تھے۔ شعر کہتے وقت دنیا تنہائی چاہتی ہے لیکن داغ کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے وہ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس کوئی شخص نہ ہو تو میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ میرے

اور پہناوا کسی قدر ڈھیلا کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ
پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی ہوتا تھا
جامہ سرخ تنزیب کا انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی
کبھی کھلی رہتی تھی کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پہ
گلشن کی بڑی دو پلی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک
لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی
تھی سامنے سے مانگ اور ماتھے پر کچھ حصہ اور بال
صاف جھلکتے تھے غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک
اور جامہ زیب آدمی تھے۔"

(دلی کا آخری یادگار مشاعرہ)

مومن ایک رنگین مزاج آدمی تھے لیکن
جوانی میں سید احمد صاحب سے بیعت کر لی تھی اس
لئے مذہب سے کافی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور
اس کے ارکان پر عمل پیرا تھے۔ آپ غیر مقلد تھے
اور سختی کے ساتھ اپنے عقیدوں کے پابند اپنے
کلام میں اکثر جگہ اہل تشیع اور مقلدین خصوصاً
احناف پر چوٹیں کی ہیں اور بعض جگہ حد سے آگے
بھی بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً ؎

وہ شوخ بے سبب آزار ہے کہ خونریز
کہ جرم قاتل عثمان رض کا نہ ہو قاتل
وہ نکتہ داں کہ تقلید کو اصل دیں کہے
دم شکایت عاشق نہ ہو جفا سے خجل

یہ کچھ وہ سنت نہ طریق توحید
پھر کیا ہے سوائے سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنی
حیراں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار
پر تو یہ ہے ازبسکہ ہوا میں بیمار
مے بہر دوا پینے کو مفتی کے حضور
تقلید ابوحنیفہ رض کا ہے اقرار

مومن نہایت خوددار اور غیور تھے کبھی کسی
سے کچھ طلب کرنا یا کسی کا احسان لینا گوارہ نہ تھا۔ اسی
بنا پر کسی دربار یا رئیس سے منسلک نہ ہوئے۔ بلکہ اپنی
اس بے نیازی کی بنا پر رام پور بھوپال وغیرہ ریاستوں
کی دعوت کو بھی رد کر دیا۔ اگر چند مرتبہ بعض مجبوریوں کی
بنا پر دہلی چھوڑ کر دوسری ریاستوں میں بھی جانا پڑا
لیکن دل نہیں لگا اور گھبرا کر جلدی واپس آگئے اپنے
ان سفروں کا ذکر انہوں نے ان اشعار میں کیا ہے مثلاً۔

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا جوش
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

بداوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی سے
یہ کیونکر چارۂ پند خردمنداں ہوش آیا

حکیم صاحب ۵۲ سال کی عمر میں ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے
سے گر کر پانچ ماہ بعد وفات پائی گرنے کی تاریخ خود ہی

کہہ چکے تھے "دستِ بازو بشکست" ان کا ایک
شاگرد آہنی نے انتقال کی تاریخ کہہ دی ("ماتم مومن خاں") دہلی میں شاہ عبدالعزیز کے مقبرہ کے باہر دفن ہوئے یہ رباعی غالب نے ان ہی کے انتقال پر کہی تھی ؎

سر طست کرو دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مومن کا شمار اردو کے صاحب طرز شعرا میں ہوتا ہے۔ اپنی ذہانت طباعی اور دل فریب شاعری بنا پر انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ حاصل ہے ان کے کلام میں نازک خیالی اور بلند پروازی ہے تشبیہوں اور استعاروں کی غیر معمولی نوعیت نے کلام میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ ان کے کلام میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو حاصل ہے۔ اور ان کی غزلوں میں وہ سوز اور گداز پیدا ہو گیا ہے جو پڑھنے والے کے دل پر مرثیہ کی طرح اثر کرتا ہے ؎

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

دراصل مومن کے کلام میں تغزل کا اپنے کلام پر چھا جانا ان کی وہ سب سے بڑی خصوصیت ہے، جو انھیں دیگر استادوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اور دوسرے شعرا جہاں جس کے نا ہونے یا کمی کی بنا پر انہوں نے ان پر طنز کیا ہے ؎

مومن یہ شاعروں کا ہے آگے رنگ [illegible]
جوں پیش آفتاب ہو بے نور ہر چراغ

حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی
آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا

اس لیے اپنے بارے میں ان کی اس تعلی کو بیجا نہیں کہہ سکتے کہ ؎

سن رکھو، سیکھ رکھو، اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اسے اہل فن اظہار ہنر کرتا ہے

ایسی غزل کہی کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمیں کو مسجد بنا دیا

نازک خیالی مضمون آفرینی خاص شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اردو میں مومن وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس چیز کو اپنے کلام میں برتا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا مثلاً ؎

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

کرِ شاعرانہ کا مطلب ہے کلام میں کسی بات کو اس انداز سے ادا کرنا کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرے لیکن حقیقت میں فائدہ کہنے والے کا ہو۔ مومن نے اس وصف کو اپنی ہاں بہت خوبی سے سجایا ہے ؎

سرگیں آنکھوں سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

طنز (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا) اصل مقصد
پائی جاتی ہے

سائل دہلوی

پیدائش اور پرورش

نواب سراج الدین احمد خاں سائل، ۲۹ شوال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں یعنی غدر کے صرف دس سال بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔

"۱۸۵۷ء کے غدر نے دہلی کے ہر شریف اور معزز خاندان کو تباہ و برباد کر دیا تھا مگر سائل صاحب کے والد خصوصیت سے صاحبانِ والا شان کی نگاہِ عتاب کے شکار ہوئے ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے باغیوں کا ساتھ دیا ہے۔ چنانچہ انھیں لوہارو کی نوابی سے محروم کر کے اُن کے بھائی کو نواب بنا دیا گیا۔ سائل صاحب کی پرورش و پرداخت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں ٹھاٹھ دار زندگی اور آرام و آسائش کا دور دورہ تھا۔ لال دروازہ اور فراش خانہ آج بھی زبانِ حال سے اس کی گواہی دے گا۔"

(مجاہد حسین حسینی "دلی کالج میگزین" سائل دہلوی اور ان کی شاعری صفحہ ۲۵)

شجرۂ نسب

سائل مرحوم کا مختصر شجرہ نسب یوں ہے:۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر والیٔ فیروزپور جھرکہ و لوہارو بن نواب مرزا عارف خاں بیگ بخارائی۔

حضرت سائل نے اپنے ایک شعر میں نسلاً بعد نسل نوابی کا فخریہ ذکر اس طرح کیا ہے ؎

سائل کو تم نہ چشم حقارت سے دیکھنا
"نواب" پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے!

(مجاہد حسین حسینی، دلی کالج میگزین صفحہ ۲۵)

شکل و شباہت

نواب سائل عجیب وضع قطع رکھتے تھے۔ لمبوترے کتابی چہرے پر سفید براق ڈاڑھی ان کی معصومی فطرت کی غمازی کرتی تھی۔ اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوکدار ناک اور گلے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی۔ قد اچھا خاصہ لمبا تھا۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگائے رہتے تھے۔ اور مخملی ٹوپی سر کی زینت ہوتی۔ چست پاجامہ اور سلیم شاہی جوتی ان کا خاص پہناوا تھا۔ کبھی کبھی نیچے مٹے کا آڑا پاجامہ اور کھلی آستین کا ململ کا کرتا زیبِ تن

کرتے رکند سے پر رومال ہوا کرتا تھا۔

(ایضاً)

علاوہ اس کے سائل صاحب کو انگرکھے پہننے کا بہت شوق تھا۔ اور اکثر و بیشتر انگرکھے پہنتے۔ حالانکہ اس دور میں انگرکھے کی جگہ شیروانی نے لے لی تھی۔ اور اکثر امراء و شرفا شیروانی زیادہ استعمال کرتے تھے۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ ان کی شخصیت میں قدیم و جدید کا بڑا حسین امتزاج ملتا تھا۔ مثلاً اگلے وقتوں کے نوابوں کی طرح جہاں ان کے بائیں ہاتھ میں گھوڑا زنجیری ہوتی تھی وہیں دائیں ہاتھ میں جلتا ہوا سگار بھی ہوتا تھا

(ایضاً)

تعلیم شرفائے دہلی کے وضع کے مطابق سائل نے فارسی و عربی کے ساتھ ساتھ فقہ و طب میں بھی درک حاصل کیا تھا۔ فنون سپہ گری بھی سیکھی اور تھوڑی بہت گانے کی مشق بھی بہم پہنچائی۔

(ایضاً)

لالہ سری رام مولف خمخانہ جاوید سائل کی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"چار برس کے ہوں گے کہ سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا۔ اپنے جد بزرگوار کے سایۂ شفقت میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور فارسی کی درسیات خود ان سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ چنانچہ فارسی کی استعداد قابل داد ہے"

(خمخانہ جاوید مولفہ لالہ سری رام جلد چہارم صفحہ ۵)

اپنے جد بزرگوار کے بعد انھوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں۔

(لالہ سری رام ایم۔ اے۔ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱)

شادی سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خاں والئی پٹودی کی ہمشیرہ تھیں۔ اس بیوی سے ایک بیٹا ہوا تھا جو صغر سنی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا تھا۔ یہی لڑکا ان کی کنیت ابوالمعظم کا باعث ہوا۔

(نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۰)

دوسری شادی لاڈلی بیگم سے ہوئی۔ یہ لاڈلی بیگم فصیح الملک داغ دہلوی کی منہ بولی بیٹی اور ان کی حقیقی سالی کی دختر تھیں۔ لاڈلی بیگم پہلے سائل کے چھوٹے بھائی مرزا امتیاز الدین احمد خاں مرحوم کو بیاہی ہوئی تھیں۔ سائل سے وہ تقریباً بیس برس چھوٹی تھیں مگر استاد کے رشتہ سے سائل ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور وہ بھی نواب صاحب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

(دلی کالج میگزین صفحہ ۲۵)

اخلاق و خصائل حضرت سائل بڑی ہی خوبیوں کے مالک تھے۔

تھے۔ انتہائی حلیم الطبع اور بردبار۔ انگریز ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور ان کی شیریں زبانی و خندہ پیشانی کی وجہ سے ملنے جلنے والوں کا ایک تانتا سا لگا رہتا

پاس جب لوگ نہیں ہوتے تو گھبرا اٹھتا ہوں۔ دل چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر کہیں نکل جاؤں بھائی میں قبر میں بھی تنہا نہیں رہ سکتا اول تو کسی کو ساتھ لے جاؤں گا اگر کوئی راضی نہیں ہوا تو کسی کی تصویر ہی ساتھ لیتا جاؤں گا اگر تصویر بھی نہ لے جا سکا تو فرشتے سوال جواب کرنے آئے گے تو میں ان میں سے کسی ایک کو پکڑ لوں گا بہر حال قبر میں بھی تنہا نہیں رہوں گا۔

مرزا صاحب کا داد دینے کا طریقہ بھی دوسرے شعراء سے بالکل مختلف تھا وہ عام شعراء کی طرح کسی اچھے شعر کی داد واہ واہ سے نہیں دیتے بلکہ بڑی خاموشی اور متانت سے شعر سنتے رہتے۔ شعر کوئی اچھا ہوا تو بہت خوب کیا کہنا اور بہت اچھا کہتے تھے یا شعر کو دوبارہ پڑھواتے تھے۔ شاگردوں کے کلام کو سننے کا انداز بھی بالکل مختلف تھا مگر کوئی شعر اچھا ہوا تو ماشاءاللہ کہہ دیا اور اگر کسی شعر کو ڈھیلا پایا تو خاموش رہتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جب کبھی ایسے لوگ اپنا کلام سناتے تھے تو ان کے حاشیہ نشین اور حاضر باش واہ واہ اور آوازۂ داد سے زمین و آسمان ایک کر دیتے تھے۔ مگر داغ ہمیشہ ایسے موقع پر بڑی خاموشی اور تحمل سے کام لیتے اور بہت قاعدے قرینے سے داد دیتے تھے۔ وہ اچھے اشعار پر بہت افزائی اور غلط اشعار پر اعتراض کرنے سے ذرا نہیں چوکتے تھے اور اکثر ان کے اعتراض پر بدمزگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

آپ اکثر صبح ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک اور شام کے آٹھ بجے سے نو بجے تک غزلوں پر اصلاح کے لئے بھی کچھ وقت نکالتے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص غزل سناتا تھا شعر سن کر اچھا ہوا تو ہوں کر دیا اور اگر اصلاح کی ضرورت ہوئی تو کہا "کیا" پڑھنے والے نے دوبارہ شعر پڑھا اور آپ نے اسی وقت الفاظ کو الٹ پھیر کر کے اصلاح دیدی۔ آپ بھی مرزا غالب کی طرح بہت حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے دوست ملنے آئے، وہ نماز پڑھتے دیکھ کر جانے لگے جب آپ نے سلام پھیرا تو وہ جاتے ہوئے نظر آئے کسی شخص سے انھیں بلوا یا اور وہ صاحب لوٹ آئے۔ داغ صاحب نماز سے فارغ ہو کر ان سے بولے میاں کہاں آئے اور کہاں واپس چلے آپ کے دوست نے جواب دیا کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے میں واپس ہو رہا تھا داغ ہنسے اور بولے کہ بھائی میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔

داغ کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار تھی اس ایک ہزار کی رقم سے ساڑھے چھ سو روپیہ ماہوار جو اپنی بیوی کو دیا کرتے تھے وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو گھر کے اخراجات اور بعض دوسرے ضرورت مند قربا کی مدد پرورش کے لئے دیتے تھے، ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار کا اپنا ذاتی اور پرائیویٹ خرچ تھا۔ داغ کے کچھ ایسے قلبی دوست تھے جن کا انتقال ہو گیا تھا آپ حق دوستی اس طرح ادا فرماتے تھے کہ ان کی بیواؤں اور بچوں کو ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے

چند قومی اداروں سے مثلاً مدرسہ طبیہ دہلی، حمایت اسلام لاہور وغیرہ کو بھی سالانہ امداد دیتے تھے۔ بعض بیواؤں کی بھی تنخواہیں مقرر تھیں۔

آپ نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ حیدر آباد میں ہی گزارا۔ حیدرآباد میں ہی فالج گرا زبان بند ہوگئی اور کچھ دنوں بیمار رہ کر ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا

چار دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ ہیں جن سے آپ کی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ داغ کے کلام پر نظر ڈالنے سے چند باتیں صاف نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز زبان کی صفائی اور روانی ہے۔ ثقیل الفاظ اور فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بڑی حد تک گریز کیا ہے۔ چلبلاپن اور شوخی ان کے کلام کی جان ہے لیکن یہی شوخی ابتذال تک پہنچ جاتی ہے اور رنگیں بیانی عامیانہ پن کی جھلک لئے محفل ادب میں نمودار ہوتی ہے۔ کچھ اشعار لکھتے ہیں جن سے آپ کے کلام کی شوخی ظاہر ہوتی ہے۔

کرتی ہے زیر پردۂ فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ اس دنیا میں بھرم نکلے

ہم بھی کچھ کہتے وہ بھی کچھ کہتے
بات چیت ان سے اب نہیں ہوتی

کہہ دیں گے ہم تو داورِ محشر سے صاف صاف
اچھوں کو دل نے پیار کیا ہم نے کیا کیا

محشر میں بعد پرسش اعمال دیکھنا
ہم دیکھتے پھریں گے تماشا ادھر ادھر

بقیہ مومن صفحہ ۔ کا

کبھی تو مخاطب کو جلی کٹی سنا کر دل کی بھڑاس نکالتا اور کبھی اس کو غصہ دلا کر اپنی مطلب براری ہوتا ہے۔ کلام میں طنز اور تعریض کی موجودگی شاعر کی ذہانت اور اس کی قدرت زبان پر بڑا ثبوت ہے ؎

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اس پہ بھی
کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے
زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

کسی بھی شاعر کی زور طبیعت اور تخیل کی بلندی کا پتہ وہاں چلتا ہے جب وہ کسی افسردہ خیال کو نئے انداز سے ادا کرتا ہے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں ؎

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا نہ ہر عدو ذلاؤں کہاں سے

بجلی گری فغاں سے میری آسمان پر
جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا

کیا سب [illegible] گئے اور آخرکار حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حملہ کا منصوبہ تیار کیا گیا جس کے مطابق شہر کے شمالی حصے کی طرف سے حملہ کرنا قرار پایا۔ انگریزوں نے خوب دیکھ بھال کے بعد چار جگہ توپوں کے مورچے لگائے اور چاروں جگہ سے گولہ باری شروع کی گئی۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو فصیل میں دو جگہ شگاف پڑ گئے۔ ۱۴ تاریخ سے ۲۰ تاریخ تک گولہ باری ہوتی رہی اور انگریزی دستے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۰ تاریخ کو میجر برنڈ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا شاہی مسجد میں پہنچ گیا۔ اسی دن لال قلعے پر حملہ ہوا اور اس پر بھی قبضہ ہو گیا۔

۲۰ ستمبر کو ولسن لال قلعے میں پہنچا اور دیوان خاص کو اس نے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس دن شراب کے ذریعے سے دیوان خاص میں ملکہ وکٹوریہ کا جام صحت نوش کیا گیا۔ لال قلعہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوا تھا دو سو نو سال کے بعد اس کے در و دیوار نے ایک اجنبی حکمران کا جام صحت تجویز ہونے کی صدا سنی

۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج نے دہلی پر فیصلہ کن حملہ کیا تھا۔ ۱۶ ستمبر کو خود بہادر شاہ ہوادار پر بیٹھ کر فوج کے ساتھ نکلے کہ انگریزی فوج کا مقابلہ کریں اور قلعے سے دو سو گز لال ڈگی کے پاس ٹھہرے رہے۔ انگریزی فوج کی گولیاں وہاں تک آ رہی تھیں۔ اس لیے افسران فوج نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرے رہنا مناسب نہیں۔ ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے بادشاہ وہاں سے ہٹ گئے۔

۱۹ ستمبر تک شہر کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو بادشاہ کو بھی یہ مناسب معلوم ہوا کہ لال قلعے سے نکل کر باہر چلا جائے۔ اس وقت بادشاہ عمر کی پچاسی منزلیں طے کر رہے تھے اور ان میں وہ عزم ہمت، جانفشانی اور جانبازی نہ تھی جس کی ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ہمایوں کے مقبرے میں منتقل ہو گئے۔ بہادر شاہ کے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچنے کے بعد بہت سی سازشیں ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کو گرفتار کرا دیا جائے اور اس کی قیمت انگریزوں سے وصول کی جائے۔ بات چیت سے یہ طے ہو گیا اور انگریزی سپہ سالار میجر ولسن کی جانب سے ہوڈسن ۸۵ سواروں کو لیکر ہمایوں کے مقبرے کی طرف بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ گفت و شنید کے ذریعے یہ طے ہو گیا کہ بادشاہ کی جان بخشی کر دی جائے گی اور اُس نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ ہمایوں کے مقبرے سے سواریاں روانہ ہوئیں۔ کل ۹۶ افراد بادشاہ کے ساتھ تھے بادشاہ کو دہلی دروازے سے شہر میں نہ لایا گیا۔ بلکہ لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گذار کر لال قلعے پہنچایا گیا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ کے جذبات کیا

ہوں گے؟ - وہی لال قلعہ تھا جس کا دیوان خاص کبھی تخت طاؤس سے مزین تھا۔ اور بڑے بڑے گردن افرازوں کے سر اس کے سامنے جھکتے تھے۔ وہی لال قلعہ تھا جسے مغلوں کا دورِ عروج اور ہندوستان کے شکوہ و شوکت کی وہ بہار دیکھی تھیں جن کی مثال شرق و غرب کی کوئی بھی بادشاہت پیش نہ کر سکی۔ اب اسی لال قلعے میں شاہ جہاں اور عالمگیر کی میراث کا آخری حامل ایک بے بس اور بے کس قیدی کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔

شہر میں انگریزی افواج کے داخلے کے ساتھ ہی لوٹ مار کی قیامت برپا ہو گئی تھی اور بادشاہ کی گرفتاری کے بعد قتل و غارت گری کی کوئی حد ہی نہ رہی۔ جو ہاتھ لگا اور جس پر ذرا شبہ ہوا اسی کو دار پر کھینچ دیا گیا۔ تمام شہزادے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور ان کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ دی گئیں۔

انگریزی تاریخوں میں مقتولین کی تعداد صرف ۱۶۰۰ لکھی ہے جو بالکل غلط ہے۔ سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:

"ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔
سات دن برابر قتلِ عام رہا اس کا حساب نہیں
اپنے نزدیک نسلِ تیموریہ کو نہ رکھا بلکہ مٹا دیا۔
بچوں تک کو مار ڈالا مستورات سے جو سلوک کیا
بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے"

۔ بہادر شاہ ۲۱ یا ۲۲ ستمبر کو گرفتار ہوئے تھے اور ان کے خلاف مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو شروع کیا گیا۔ اور ۹ مارچ تک کل ۲۱ پیشیاں ہوئیں۔ اسی دن فیصلہ سنا دیا گیا۔ فوجی عدالت کے فیصلے کے مطابق تمام الزامات درست تھے۔ اور اس فیصلہ کی تصدیق کے بعد بہادر شاہ کے لیے موت کے سوا کوئی سزا تجویز نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ ان کی جان بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا اس لیے یہ سزا خارج از بحث تھی اس لیے حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ بہادر شاہ کو سنگین پہرے میں کلکتہ بھیجا جائے اور ان کی آئندہ منزل کا فیصلہ کلکتہ پہنچنے کے بعد کیا جائے گا نومبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ کو کلکتہ روانہ کیا گیا۔ بہادر شاہ کے کلکتہ پہنچنے سے پیشتر ہی ان کو رنگون بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ کلکتہ پہنچتے ہی بہادر شاہ اور ان کے ساتھیوں کو جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ اور جہاز بے تامل روانہ ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء کے اختتام سے پیشتر ہی وہ رنگون پہنچ گئے تھے۔ جہاز سے اترتے ہی انہیں صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گئے جو گھوڑ دوڑ کے پرانے میدان کے قریب تھا۔ جس سڑک پر یہ بنگلہ واقع تھا اسے آج کل رائل روڈ کہتے ہیں۔

بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ رہتا تھا۔ سرکار انگلشیہ سے صرف چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ بہادر شاہ نے اس کے لیے خود کوئی درخواست پیش

کرنا گوارا کیا۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات
بچ گئے تھے، انہیں کو بیچ کر ضرورتیں پوری کرتے رہے
زمانہ اسیری کی چند نظمیں بھی مشہور ہیں۔ لیکن
ان کا انتساب محل نظر ہے اس زمانے میں انہوں نے
جو کچھ کہا ہوگا۔ اس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک
حرف کا دامن، خونِ جگر سے تر ہوگا لیکن کچھ کہنے کی
ضرورت بھی نہ تھی اس لیے کہ وہ خود ایک ایسا دردناک
نوحہ بن گئے تھے جو کسی تشریح و توضیح کا محتاج نہ تھا۔

وفات :- بیان کیا جاتا ہے کہ چہل قدمی یا ہوا خوری
کے لیے بھی بہت کم نکلتے تھے۔ بیشتر وقت خدا کی
یاد، و تسبیح و استغفار میں گزارتے تھے۔ اس طرح
۱۳ر جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ مطابق ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء
کو قیدِ حیات و قید فرہنگ دونوں سے نجات پائی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

بیان کیا جاتا ہے کہ موت کے وقت زینت محل،
جواں بخت، ان کی بیوی اور ایک خورد سال بچی
کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ وفات کے بعد حکام سے
دفن کی اجازت طلب کی گئی اور اسی بنگلے کے احاطے
میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ قبر کچی تھی اور پاس بیری کا
ایک درخت تھا۔

زینت محل نے کچھ مدت اسی بنگلے میں گزاری
پانچسو روپے انہیں ملتے تھے۔ اور پانچسو شہزادہ جواں بخت
کے لیے مقرر تھے۔ پھر انہیں دوسرے مکان میں
منتقل ہونا پڑا۔ زینت محل شوہر سے کوئی چوبیس سال بعد
۱۷ر جولائی ۱۸۸۶ء کو فوت ہوئیں اور انہیں بھی شوہر کے
پہلو میں ہی دفن کیا گیا شہزادہ جواں بخت والدہ سے
دو سال پیشتر بمقام مولمین (جنوبی برما) فوت ہو چکے تھے
اور ان کی قبر کا نشان تک موجود نہیں۔

ظفر کی شاعری

بہادر شاہ کا عہد سیاسی اعتبار سے سلطنت مغلیہ کا دم واپسیں
تھا لیکن شعر و شاعری کے لیے بہار جانفزا ثابت ہوا۔

ظفر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ خوش
نوایانِ سخن کی آزمائش گاہ اور زبان اردو کی ٹکسال تھی۔
قلعہ معلّٰی میں دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتیں
اور اشعار کے دفتر کھلتے۔ ظفر بھی نوعمری ہی سے ان
دلچسپیوں میں حصہ لینے لگے۔ اور فطری لگاؤ کے باعث
یہ مشغلہ اُن سے آخری دم تک نہ چھوٹا۔

ظفر ابتدا میں شاہ نصیر کے شاگرد رہے۔ ان
کے دکن چلے جانے کے بعد ظفر کچھ دن میر کاظم حسین
بیقرار کے شاگرد رہے جب وہ بھی دتی کو خیرباد کہہ
گئے تو ذوق سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ ذوق کی وفات
تک سیتالیس برس یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذوق کے انتقال
پر استادِ شہ کی جگہ مرزا غالب کو ملی۔

ظفر اپنے عہد کے سب سے زیادہ پرگو شاعروں
میں تھے۔ بہت سے اصناف سخن پر انہوں نے طبع آزمائی
کی ہے۔ خود کہتے ہیں۔ ع

دیوانِ ظفر کا دیکھ کے کاتب ہیں کہہ رہے
لکھیں کہاں تک تری ہم کلیات کو

ظفر کا تغزّل

ظفر کی بیشتر شاعری اردو کے روایتی تغزل پر مبنی ہے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا جز، خارجی شاعری، محاکات، سراپا نگاری، معاملہ بندی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ رعایت لفظی کے کافی شوقین ہیں۔ جیسے:

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا اپنے سر، لیتے تو ہم لیتے
لگایا جام جو ہونٹوں سے اس نے ہم کو رشک آیا
کہ بوسہ اس کے لب کا اے ظفر، لیتے تو ہم لیتے

اُن کے یہاں ادا بندی، سراپا نگاری اور معاملہ بندی سے لیکر ضلع جگت تک سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کی تفصیل طول چاہتی ہے۔ البتہ اُن کے آرٹ کے کچھ اور پہلوؤں کو دیکھیے۔ محاکات کی بعض جگہ خوب خوب داد دی ہے گو بیشتر کلام لفظی صناعی سے پُر ہے اور ایجاز و اختصار کم ملتا ہے۔ مگر بعض موقعوں پر چند سہل و سادہ الفاظ میں نہایت مکمل اور موثر تصویر کھینچ کر دکھائی ہے ؎

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشمِ تر او ہو ہو!
خونِ جگر آ ہا ہا۔ لختِ جگر او ہو ہو!

ظفر کو جذبات کے اظہار پر کافی قدرت حاصل تھی۔ ایسی زمینوں میں بھی جہاں جذبات نگار کے قدم نہیں جم سکتے انھوں نے بڑی کامیابی سے جذبات نگاری کر کے دکھائی ہے۔ بیشتر کلام ان کا عام جذبات عشق و محبت سے پُر ہے۔ ظفر کے تغزل کا معیار تمام اس قسم کے اشعار میں نظر آئے گا۔

بدنام ہے جہاں میں ظفر جن کے واسطے
وہ جانتے نہیں کہ ظفر کس کا نام ہے

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل، کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل، کبھی ایسی تو نہ تھی
نگہ یار کو اب کیوں ہے تغافل اے دل
وہ ترے حال سے غافل، کبھی ایسی تو نہ تھی

تصوّف

ظفر کا دوسرا موضوع سخن تصوف ہے اور تغزل کے بعد ان کے کلام میں سب سے زیادہ متصوفانہ اشعار ہی کی بہتات ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جامِ شراب
مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

چنانچہ ظفر کے یہاں خمریات کا اتنا زور نہیں جتنا تصوف کا ہے۔ ظفر کے صوفیانہ کلام میں بعض جگہ خواجہ میر درد کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور وہی انداز کلام کی کسی قدر معصومانہ سادگی پائی جاتی ہے۔ جو دردؔ کے نشتروں کا جوہر ہے۔

وارداتِ و یاسیت

کلامِ ظفر میں جابجا اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اگرچہ ظفر اپنے دُکھ درد کا بیان اپنی حیثیت کے منافی سمجھتے تھے۔ اور جگہ جگہ انہوں نے خود کو اس سے باز رکھنے کی تلقین کی ہے۔

محبت میں گولاکھ صدمے ہوں دل پر
ظفر کچھ نہ نکلے خبردار منہ سے
ظفر کہتے ہو کیا دل کی حقیقت!
کسی محرم سے جو گزرے سو گزرے
ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غم کہہ نہیں سکتے
پر جو سبب غم ہے وہ ہم کہہ نہیں سکتے

انہوں نے اپنی شاعری کو واقعات زندگی کے اظہار کا ذریعہ نہ بنانا چاہا۔ اور اس پر تغزل کا ایک جھر جھرا سا پردہ ڈالے رکھا مگر شعر کیفیت قلبی کے اظہار سے کیوں کر باز رہ سکتا تھا۔ بہ قول انہی کے ؎

ظفر شعر و سخن سے رازِ دل کیوں کر نہ ہو ظاہر
کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

اندازِ کلام

ظفر کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی، بے تکلفی، فصاحت اور محاورہ بندی وغیرہ ہیں۔ اِن میں سے ہر خصوصیت اردو شاعری میں بہت ارزاں ہے مگر ان کے مجموعے سے ظفر کے کلام میں جو رنگ پیدا ہوا ہے وہ اس قدر منفرد اور بے مثال ہے کہ کسی دوسری جگہ مشکل سے مل سکے گا۔ وہ اپنے مطالب کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ فصاحت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا اور کلام کی بے تکلفی اور سادگی و سلامت اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ظفر کا کلام سہل ممتنع بھی ہے اور دشوار ممتنع بھی۔ وہ حتی الامکان گراں فارسی ترکیبوں اور الفاظ سے گریز سے کرتے ہیں۔ اور خالص ہندوستانی زبان میں شعر کہتے ہیں جس میں قلعہ معلٰی کی فصاحت اور محاورہ بندی شامل ہے۔ شستگیٔ زبان اور محاورات کے بے ساختہ استعمال میں شاید ہی کوئی ظفر کا ہم پلہ ہو۔ ان کی فصاحت کی خوبی یہ ہے کہ محاورات کو چن چن کر دکھانا ممکن نہیں یہ شعر میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے نہیں بلکہ مٹھاس کی طرح گھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

کیا کیا نہ کیا اور ہیں کیا کچھ نہیں کرتے
کچھ کرتے ہیں ایسا بخدا کچھ نہیں کرتے

دلِ غمِ الفت سے مضطر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
چشم آبِ گریہ سے تر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
تم جو کہتے ہو ظفر کو کچھ نہیں یہ آدمی
خیر بہتر بندہ پرور کچھ نہیں تو کچھ نہیں

میرے رونے پہ کیوں ہنستے ہو صاحب خوش کی جا ہے
مقدس کا نہیں مٹتا ہے لکھا بندہ عاجز ہے

عرش ملسیانی

۲۰ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو ملسیاں ضلع جالندھر میں پیدا ہوا۔ میرے والد ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی، مرزا داغ کے شاگرد و جانشین ہیں۔ پہلے محکمۂ نہر میں اوورسیر تھا۔ اس غیر ادبی زندگی کو ایک سال کے بعد ہی خیر باد کہہ دیا۔ نامکمل تعلیم کو مکمل کیا۔ معلم رہا۔ دفتروں میں نوکری کی۔ آخر ۱۹۴۸ء میں "آج کل" سے وابستہ ہوا۔ جوش ملیح آبادی کے پاکستان جانے کے بعد ان کی جگہ مدیر مقرر ہوا۔ اردو اور ہندی میں متعدد تصنیفات ہیں۔

نظریۂ شاعری عظمتِ اولادِ آدم کے گیت گانا۔ صالح اقدارِ زندگی کو شاعری کے ذریعہ عوام تک پہنچانا۔ ہر گروہ بندی سے بے نیاز رہنا۔ اور اپنی دنیا الگ بنائے رکھنا۔

عرش ملسیانی
۲۸ر مئی ۱۹۶۶ء

میں چپ رہوں تو عشق پہ تہمت ہے کیا کروں
فریاد بھی خلافِ محبت ہے کیا کروں

میری خوشی تھی باز نہ آتے وہ ظلم سے
اس جور و ستم سے اس کو ندامت ہے کیا کروں

منہ دیکھنے کو بھی تو کوئی آئینہ نہیں
ہر ایک دل میں گرد کدورت ہے کیا کروں

اب مجھ کو ان سے کوئی شکایت نہیں رہی
اس کی بھی ان کو مجھ سے شکایت ہے کیا کروں

اب ان کی برہمی کے مزے بھی نہیں نصیب
فریاد سے بھی اب انھیں راحت ہے کیا کروں

ہے آرزو کہ حکم خدائی یہ ہو مرا
یہ آرزو خدا سے بغاوت ہے کیا کروں

جی چاہتا ہے لاکھ سیاست سے ہو گریز
حسن اور عشق میں بھی سیاست ہے کیا کروں

آئے گی ایک روز قیامت سنا ہے یہ
ہر روز زندگی میں قیامت ہے کیا کروں

جی چاہتا ہے عرش کروں ترک شاعری
لیکن یہی ذریعہ عزت ہے کیا کروں

جگن ناتھ آزاد

نظریۂ شاعری

اگرچہ شعر کہنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے لیکن تقسیم ہند تک میں نے شعر کہنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی اور اسے تاش کھیلنے یا سینما دیکھنے سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی تھی۔

شاعری کے متعلق کسی زمانے میں مَیں بھی یہی سمجھتا تھا کہ یہ ایک الہامی چیز ہے اور آسمان یا اُس سے بھی اونچی بلندیوں سے یہ دلِ شاعر پر نزول کرتی ہے۔ اور وہاں سے صفحۂ قرطاس پر لیکن اب داخلی اور خارجی واردات نے میرے اس نظریئے کو ختم کر دیا ہے۔ اب شعر کہنے کے لیے میں اُس آسمانی برکت کا منتظر نہیں رہتا۔ بلکہ اب جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اُس سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے ہر شعر افادیت کے نقطۂ نگاہ سے کہا ہے:

چند پسندیدہ اشعار

کہہ دو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

بہار والو! اسی گلستاں کے ایک گوشے میں شاخِ گل پر
مرا بھی اک آشیاں تھا لیکن بہار کی داستاں سے پہلے

کیا جانے کس آنے والے دور کی یہ تیاری ہے
حال کا لمحہ لمحہ ماضی کی صدیوں پر بھاری ہے

دیکھی تھی جھلک تیری اک لمحہ کبھی میں نے
بس اس پہ بنا ڈالا دنیا نے اک افسانہ

رسوائی سے گھبرا کر دامن جو چھڑاتے ہو
اس میں تو زیادہ ہے اندیشۂ رسوائی

اک روز کے ملنے پر احساس یہ ہوتا ہے
جس طرح کہ تم سے ہو برسوں کی شناسائی

تم آ گئے جب یاد تو یہ بھی نہ رہا یاد
کب تم نے بھلایا مجھے کب تم نے کیا یاد

مشیر جھنجھانوی

میں اور میری شاعری

اس دور میں ایک شاعر یا ادیب کی زندگی ہی کیا اور وہ بھی مجھ جیسے پریشان حال شاعر کی بقول خود ؎

دھندلے سے کچھ نقوش ہیں وہ بھی کہیں کہیں
تصویرِ زندگی کی تمہیں کیا دکھائیں ہم

میں نے بہت چاہا کہ اپنی زندگی کی اس بے رنگ تصویر میں خامۂ فکر و نظر سے کچھ رنگ آمیزی کروں مگر نامساعد حالات اور شورشِ دہر نے خامہ کا رُخ اس طرح موڑا کہ تصویرِ حیات رنگین ہوتے ہوئے بھی بے رنگ ہو گئی بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی جدید مصوری یا "ABSTRACT ART" کا شاہکار ہے۔ جس کو سمجھنے کے لیے فرشتوں کی نظر اور ابلیس کا ذہن چاہیے بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کہ میں تا دمِ تحریر نمائش گاہِ عالم کے ایک گوشہ پہ آویزاں ہوں اور یہی گوشہ میری نشان دہی کر رہا ہے۔

نام سید مشیر الحسن علوی۔ تخلص :۔ مشیر
ولدیت :۔ ڈاکٹر سید ناظر حسین مرحوم۔

وطن اور جائے پیدائش قصبہ جھنجھانہ۔ ضلع مظفر نگر۔ یو پی۔

تاریخ پیدائش :۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء (24.12.1926)

تعلیم اور پیشہ ابتدائی تعلیم شاہجہاں پور میں حاصل کی۔ بی۔ اے بریلی کالج۔ بریلی سے کیا۔ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے امتیازی شان کے ساتھ بی۔ ٹی کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں آنرز کیا اور تمام یونیورسٹی میں اول رہا۔ مجموعی طور پر تعلیمی حالت بہت اچھی رہی ہے۔ ۱۹۵۰ء سے مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہوں اور فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول میں مدرس ہوں۔

مزاجی کیفیت حسن اخلاق کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ ہمدردی، رواداری اور انسان دوستی میرا ایمان ہے اسی لئے کافی پریشان اور تنگدست رہتا ہوں۔ توکل بر خدا کا مجبوراً نہیں بلکہ صدقِ دل سے قائل ہوں۔ ظاہری نمائش اور خوشامد کا قائل نہیں اسی لئے کم آمیز اور کم گو ہوں۔ یہاں تک کہ لوگ "مغرور" یا "بڑا شاعر" سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ میں غرور و تکبر سے بہت دور ہوں۔ ایک ذی حس انسان کے لئے ذوقِ جمالیات زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ میں بھی ہر چیز میں حسن دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں چنانچہ حسن سیرت کا پرستار ہوں میری نگاہ عیب میں بھی حسن

دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں چنانچہ حسنِ صورت کا مداح اور حسنِ سیرت کا پرستار ہوں۔ میری نگاہ عیب میں بھی حسن تلاش کر لیتی ہے۔ مثلاً ؎

میں نے خزاں میں گیت بہاروں کے گائے ہیں
یہ ہے مشیرؔ میرے شعورِ نظر کی بات

ذوقِ شعری: جب سے ہوش سنبھالا ہے شعر کہتا ہوں۔ ابتدائی دور میں اساتذہ کے کلام یا دوسروں کے تجربات کو مشعلِ راہ بنایا۔ اسی لئے رسمی اور روایتی اشعار کہتا رہا۔ مگر میرا اپنا خیال اور میرے اپنے تجربات بھی رفتہ رفتہ اپنی جگہ لیتے گئے۔ جس قدر زمانہ گزرتا گیا میں اپنے انداز کے اشعار کہتا گیا۔ بے دھڑک مشاعروں میں شعر پڑھتا تھا داد یا بیداد کا کبھی اثر قبول نہیں کیا۔ اور برابر شعر گوئی میں مصروف رہا۔ اس دور میں صرف موزونیٔ طبع رہنما تھی۔ جب کچھ شعور پیدا ہوا تو ایک شفیق رہنما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ بہت غور و فکر کے بعد ۱۹۴۷ء میں اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہ جہاں پوری جانشین امیر مینائی کی خدمت میں حاضر ہوا اور مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گیا یہ محض ان کی تربیت اور رہنمائی کا فیض ہے کہ آج پورے اعتماد سے شعر کہتا ہوں۔ حضرت دلؔ مرحوم مجھ پر بے حد مہربان تھے۔ اور مجھے بھی اپنے خاندان کا عزیز ترین فرد سمجھتے تھے۔ آج بھی اس گھرانے سے وہی رابطہ قائم ہے۔

نظریہ شاعری: ابتدا غزل گوئی سے ہوئی اس کے بعد نظمیں کہنے لگا۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ طویل نظمیں بھی بہ یک نشست کہا کرتا تھا۔ مگر وسیع النظری اور شعورِ محاسن و معائب نے رہوارِ طبع کی عنا گیری کی نتیجہ یہ ہوا کہ سرپٹ دوڑنے والا دُلکی پر آ گیا۔ اب وہ زمانہ تھا کہ رفتارِ شعر گوئی سست پڑ گئی مگر اشعار میں فکر اور گہرائی پیدا ہونے لگی یا یوں کہئے کہ ؎

جس قدر ذوقِ نظر بڑھتا گیا
فرصتِ نظارہ کم ہوتی گئی

جدید اور قدیم اقدار کا حسین امتزاج میرے اشعار کی بنیاد ہے اسی لیے میں خود کو ایک "محتاط ترقی پسند" سمجھتا ہوں۔ استادِ محترم کی نسبت سے میں لکھنؤ اسکول کا ایک رکن ہوں اور چونکہ وطن دہلی سے بہت قریب ہے اور میں خود بھی ۱۹۵۰ء سے دہلی میں مقیم ہوں اس لئے "دہلی اسکول" کے اثرات بھی ایک بڑی حد تک قبول کئے چنانچہ خود ایک جگہ کہتا ہوں ؎

مشیرؔ اہلِ بینش مری ہر غزل میں
دماغ اور دل کو بہم دیکھتے ہیں

دل سے نکلی ہوئی بات اگر موزونیٔ طبع اور ذہنِ رسا کی چھلنی سے گزر جائے تو شعر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ذہن کی سطح پر ابھر کر شعر کہتا ہوں۔ ایسے عالم میں شعر کہا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے۔ اسی کو آمد یا الہامی کیفیت کہا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ آسان زبان اور الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہی جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مناسب الفاظ کا مناسب استعمال ہی شاعری ہے۔ اگر ہم آسان زبان میں نہایت خوبصورتی اور سلیقے سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ عربی فارسی، ہندی یا سنسکرت کے پرشکوہ اور نامانوس الفاظ کا سہارا لیا جائے۔ قصیدہ اس قسم کے الفاظ کا متحمل ہو سکتا ہے مگر غزل جیسی لطیف صنف سخن جو کسی بھی طرح محبوب نازک اندام سے کم نہیں ایسے گراں اور نامناسب الفاظ سے بوجھل اور مغموم ہو جاتی ہے اور یہاں تک برا مانتی ہے کہ شاعر کو قبول عام کے گراں قدر انعام سے محروم رکھتی ہے۔ میں بھی غزل کا پرستار اور دلدادہ ہوں۔ جس طرح محبوب کے ہر اشارے پر نظر رکھی جاتی ہے اسی طرح میں بھی غزل کے تمام تقاضوں کا خیال رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک غزل کہنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر سہل بھی ہے۔ وجدانی کیفیت جسے تحت الشعور کا غیر شعوری حسن عمل کہنا چاہئے، شاعر سے خود شعر کہلواتی ہے اور اس عالم میں فصیح بلیغ اور اچھا شعر کہنا کوئی مشکل نہیں۔ غزل کا مزاج تمام اصناف سخن سے الگ ہے صرف وہی شاعر اچھی غزل کہہ سکتا ہے جس کے مزاج میں شوخی، خیال میں ندرت و نزاکت، عمل میں ضبط و تحمل، اور تکلم میں خاموش اشاریت ہو۔ غزل ہی نہیں بلکہ ہر اچھا شعر ایک اچھا آدمی ہی کہہ سکتا ہے۔ شعر ایک ایسی تصویر ہے جس میں شاعر کے خد و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔

یوں تو میں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اکثر غزل کہتا ہوں اور ضرورتاً نظمیں بھی کہہ لیتا ہوں۔ نظموں میں بھی یہی خیال رکھتا ہوں کہ نئے انداز میں سلیقے سے کوئی بات کہی جائے نظمیں زیادہ تر وطن اور قوم کے جذبات کی ترجمان ہیں مثلاً رنگ چمن (زرد پتے) جنگ، نئی دیوالی وغیرہ رباعیات اور قطعات بھی کہے ہیں۔ اپنی مصروفیات اور ذہنی انتشار کے سبب اکثر پوری غزل یا نظم کہنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس سکون ناآشنا دور میں ادب اور آرٹ کی خدمت کے لئے اول تو وقت ہی کہاں اور اگر وقت ملتا بھی ہے تو وہ فکر معاش یا دیگر افکار کی نذر ہو جاتا ہے۔ میں بھی عوام میں سے ایک فرد ہوں چنانچہ دنیا میں رہ کر دنیا کے غموں سے کیونکر بچ سکتا ہوں مجھے بھی یہی فکر رہتی ہے کہ اپنے متعلقین کی تمام تر ذمہ داریاں کس طرح پوری کی جائیں۔ کس طرح شکم پری کی جائے اور کل کیا ہوگا جس شخص کے ذہن پر کل کا مشکل فضا سوار ہو وہ آج کیا کر سکتا ہے۔ کل کی فکر کرنا بہت اچھی بات ہے مگر صرف شکم پری کی فکر ایک لعنت سے کم نہیں۔ اس فکر میں مبتلا ہو کر انسان سماج ادب، اخلاق، مذہب اور تمام اقدار مستحسن سے الگ ہو جاتا ہے بلکہ بڑی حد تک انسانیت کے درجے سے دور ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھر لینا کوئی بڑی بات نہیں جانور ادھر ادھر سے منہ مار کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ اگر انسان کا یہی مقدر ہے تو اس کو بھی حیوان مطلق کہا جائے۔ انسان وہی ہے جو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور اپنے ذہن اور عمل کی روشنی سے دنیا کو جنت بنا دے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب وہ دوزخ شکم کی مادی فکر سے مکمل طور پر آزاد ہو[۴۴]

۴۴ اور یہ آزادی ہندوستان میں اکثر مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

بسمل سعیدی

میرا نظریۂ شاعری

شاعری، خیالات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ ہے، انسان جو کچھ سوچتا ہے جن حالات سے گزرتا ہے ان کا جو ردِ عمل اس کی فکر اور احساس پر ہوتا ہے وہ پوری طرح اُن کے اظہار پر قادر نہ ہو سکا کیونکہ اظہار کا ذریعہ و وسیلہ الفاظ ہیں اور الفاظ بمقابلۂ احساسات یقیناً محدود ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا کوئی مقصد ہوتا ہے یا ہونا چاہیے لیکن شاعری اور مقصد کچھ لازم و ملزوم نہیں، بڑے شاعر مثلاً فارسی میں حافظ یا سعدی اور اردو میں میر و غالب کیا شبہ ہے کہ اپنے ورثے میں بڑی شاعری چھوڑ گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کے سامنے کوئی خارجی مقصد نہیں تھا اور نہ اس پر اصرار ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی شاعری کو کسی بڑے سماجی مقصد سے وابستہ نہیں کیا، سارے مقاصد کا اولاً و آخراً تو عشق کا فرکیش ہے جس کے ہزاروں پہلو ہیں جن کی بے شمار تاویلیں تعبیریں اور تفسیریں ہمارے اساتذۂ متقدمین کرتے چلے آئے ہیں مگر اس کا حق ذرّہ بھر ادا نہ ہو سکا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ سعدی نے کہا ہے۔

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اگر اسے خودستائی یا تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو عشق کی کیفیات پر جتنے اور جیسے شعر میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہہ سکا ہوں۔ میرے ہم عصر اور ہم طرح شعرا میں بہت کم نے ایسے اور اتنی تعداد میں کہے ہوں گے اگر ان میں فکر ہے تو اس کا یہی سبب ہے کہ یہ میرے تجربات کا نچوڑ ہیں محض قافیے نے مضمون نہیں سجھایا ہے، دو چار شعر پیش کئے دیتا ہوں۔

وہ عشق ہے جو دل کو گوارا کبھی نہ ہو
اور دل رہے نہ جس کو گوارا کئے بغیر

اب حُسن سے بھی ہے عشق بیزار
دیوانے کی کس سے دوستی ہے

عقل، بیداریٔ شعور ہے صرف
عشق انسان کی ذہانت ہے

عشق نومید تو نہیں لیکن
عشق امید پر نہیں ہوتا

گزر کے عشق کی حد سے بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے عشق ابھی ان کے حسن سے کم ہے

کافر خدا کرے کہ وہ تیرا شباب ہو
مرجاؤں جس گناہ سے توبہ کئے بغیر

محبت اے معاذ اللہ محبت، دم نکل جائے
اگر محسوس بھی اتنی ہو جتنی دل میں ہوتی ہے

دیکھیں گے کیا کسی کو اب اپنی نگاہ سے
جو کچھ بھی دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

مرتا ہوں ترے قرب پہ لیکن زرہِ شوق
آتا ہوا اے کاش تجھے دور سے دیکھوں

بہی جاتی ہو جیسے روح فرطِ شادمانی سے
الٰہی چشمِ گریاں آج کس کے زیرِ داماں ہے

الوہیت بھی شامل بندگی کا لطف بھی حاصل
محبت کا بھی جذبہ ہائے کیا جذبہ ہے انساں میں
وہ کیوں ہونے لگے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ بھی شامل ہوں ترے حالِ پریشاں میں

کلمہ گو کہیں پھرتے ہیں زباں سے اپنی
آج تک نام وہی وردِ زباں ہے کہ جو تھا

کہاں دستِ شوق اور کہاں ان کا دامن
بظاہر مگر جیسے ہو دسترس میں

اسی طرح حسن کا معاملہ ہے، حسن مجازی ہو یا حقیقی شاعر کے لئے بڑی آزمائش ہے، میں نے حسن یا عشق کا کوئی غیر زمینی یا غیر زمانی تصور پیش نہیں کیا ہے وہ میرا مسلک ہے مگر اس میں انفس و آفاق کی تمیز دشوار ہے، حسن کے موضوع پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گزر کے عشق کی حد سے بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے عشق ابھی ان کے حسن سے کم ہے

نظر جب حسن آیا ہے کسی منظر میں دنیا کے
اضافہ ہو کے رہ جاتا ہے وہ تیری محبت میں

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری، ورنہ
صرف نکہت تو مجسم تو مجسم نہیں ہونے پاتی

میرا خیال ہے کسی شاعر سے کوئی مطالبہ کرنا خواہ وہ نقادوں کی طرف ہو یا سامعین کی طرف سے، غیر منطقی مطالبہ ہے، اگر کسی ضابطے یا کسی ہدایت نامے کے تحت شاعری کی تخلیق شروع ہو گئی تو ادب کا صرف لفظ ہی دنیا میں رہ جائے گا۔ اس کے معنی و مفہوم ختم ہو جائیں گے۔

ساحر

اپنا نظریۂ شاعری کیا بیان کروں! میں نے نظم، قطعہ، رباعی، مرثیہ، سلام، نعت سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی تھی اور میں غزلیہ شاعری کا قائل ہوں۔ اور غزل ہی کو شاعری کی انتہا بھی مانتا ہوں۔ "جگ بیتی" سے رغبت نہیں "آپ بیتی" کا دلدادہ ہوں۔ وارداتِ قلب کو کم از کم مناسب الفاظ میں ادا کر دینے کو ہی اصل شاعری، روحِ شاعری اور اعجازِ شاعری سمجھتا ہوں۔ "کیا کہا" اور "کس انداز سے کہا" کا حسین امتزاج ہی مجھے پسند ہے۔

سوانحِ حیات کے تحت بہت سے راز تو طشت از بام نہیں کیے جا سکتے۔ عام قاری کی دلچسپی کی چند باتیں عرض کیے دیتا ہوں۔ سنِ ولادت ۱۹۱۳ء ابتدائی تعلیم ہوشیارپور (پنجاب) کے مقامی اداروں میں پائی۔ اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کر کے اپنی آبائی پیشہ تجارت سے منسلک ہو گیا۔ ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی ایسے قابل استاد اور ماہرِ فن کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد کانپور سے ماہنامہ "جدت" کا اجرا کیا جو چند ناساعد حالات کی وجہ سے ایک برس کے بعد بند ہو گیا۔ گزشتہ سولہ سترہ برس سے دہلی میں مقیم ہوں۔ ملک بھر کے مشاعروں میں شریک ہوتا ہوں۔ رسائل میں چھپتا ہوں، اور ادبی سرگرمیوں میں بہ قدرِ فرصت و استطاعت حصہ لیتا ہوں۔ اردو سے اس قدر مانوس ہو چکا ہوں کہ ہندی کا بطور راشٹر بھاشا احترام کرتے ہوئے بھی اسے ابھی تک سیکھ نہیں سکا۔

مجموعۂ غزلیات "سحرِ غزل" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب نایاب ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے۔ دوسرا مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

وہ ابتدا کہ جلایا تھا اک چراغِ امید
یہ انتہا کہ اسے خود بجھا رہا ہوں میں

دل میں احساسِ عیش و غم نہ رہا
اب خزاں آئے یا بہار آئے

پرواز پہ دل کی متحیر ہیں مہ و مہر
کیا حوصلے اس طائرِ بے پر نے دکھائے

محبت اپنے بس کا روگ اے واعظ نہیں ہرگز
خرد کی کیا خدا کی بات بھی مانی نہیں جاتی

سکوں بھی ہے تمنا درد بھی ہے
یہ شعلہ گرم بھی ہے سرد بھی ہے

دشمنی ہی نہ ہو مآل اس کا
دل تری دوستی سے ڈرتا ہے

ان کی فرقت کا اس قدر احساس
کتنا میلا ہے چاندنی کا لباس

موت سے کس لئے ڈروں اکبیاں
موت تو ہر نفس حیات میں ہے

ترک مے کا کبھی آتا ہی نہیں دل میں خیال
ہم نے پیمانِ وفا باندھا ہے پیمانے سے

مل ہی جائے گی کہیں ڈھونڈنے والے کو بہار
ہر گلستاں میں خزاں ہو یہ ضروری تو نہیں

بقیہ: سوانح حیات اور نظریہ شعر صفحہ ۱۲۰ کا

ترا غم سہنے والے پر زمانہ مسکراتا ہے
مگر ہر شخص کی قسمت میں تیرا غم نہیں ہوتا
ستارے ڈوب جائیں چاند چھپ جائے یہ ممکن ہے
مگر داغِ تمنا کا اُجالا کم نہیں ہوتا

بقیہ صفحہ ۱۱۴ کا

خلش جدائی کی دل میں شدید ہوتی ہے
مسافرت میں قیامت کی عید ہوتی ہے

بالائے بام ان کی اگر دید ہو گئی
ہم نے تو چاند دیکھ لیا عید ہو گئی

مبارک ہو تمہیں یہ عید۔ تم تقدیر والے ہو
وہاں تم دوستوں میں دل شگفتہ کھل رہے ہوگے
یہاں تکتے ہیں ہم۔ مایوس۔ ہر بیگانہ صورت کو
نہ جانے آج کس کس کے گلے تم مل رہے ہوگے

ہاں اے ہلال عید مقدر بنا تو دے
محروم دید ہوں مری قسمت جگا تو دے
اس وقت سب کے تارِ نظر تجھ سے متصل
میری نظر کو۔ ان کی نظر سے ملا تو دے

ہلال عید نے صورت دکھائی لے کے انگڑائی
یہاں دل پر گری بجلی۔ نہ جانے کس کی یاد آئی
مسرت چھائی ہے۔ ہر سو مبارکباد کا غل ہے
ادھر آئینہ دکھلاتی ہے ہم کو شام تنہائی

حرم تک ہی اگر محدود ہوتی عاشقی اپنی
تمہیں بتلاؤ تم جیسا بتِ کافر کہاں ملتا

علی جوّاد زیدی

اعظم گڑھ (یو۔پی) وطن ہے مگر زیادہ تر لکھنؤ میں رہے، آج کل حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات میں انفارمیشن افسر ہیں اور دلّی مقیم ہیں۔ اس کے پہلے حکومت اتر پردیش و حکومت جموں و کشمیر میں کئی عہدوں پر کام کر چکے ہیں۔

۱۹۳۲ء سے رسائل و اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ تین شعری مجموعے "رگ سنگ" "دیار سحر" اور "میری غزلیں" اور نو دوسری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ دو کتابوں "میری غزلیں" اور "آپ سے بیٹے" پر حکومت اتر پردیش کا انعام اور "تعمیری ادب" پر جموں و کشمیر اکیڈمی اوٹس اینڈ کلچر کی جانب سے انعام مل چکا ہے۔ اس وقت تین مزید کتابوں کی ترتیب مصروف ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں فارسی اور عربی کا بھی ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ فارسی کے مشہور ہندوستانی شاعر غنی کشمیری کا دیوان ایڈٹ کیا ہے اور اس پر ایک سیر حاصل تحقیقی مقدمہ لکھا ہے۔ انگریزی زبان میں "ہندوستان علوم عربیہ کی ترویج" کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ آپ کا شمار اردو کے ممتاز ناقدوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔

طالب علمی کے زمانے سے تحریک آزادی میں عملی حصہ لیا اور قید و بند کی سختیاں جھیلیں۔ ترقی پسند تحریک کے اہم رکن رہے لیکن ۱۹۴۲ء میں نظریاتی اختلافات کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں ہیں اور اس کے جنرل سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ مختلف ادبی، علمی، اور ثقافتی اداروں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی کے رکن رہنے کے علاوہ "جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز" کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

انتخاب (صرف غزلوں سے)

اظہار التفات کے بعد ان کی بے رخی
اک رنگ اور نقشِ تمنا میں بھر گئی

اُس نے نظریں پھیر تو لیں بزم میں
پھر بھی ماتھے پر پسینہ آ گیا

نسیم ایک روش تک پہنچ کے تھم سی گئی
کہ نا شگفتہ کلی کا پیام لینا تھا

کس سے کہیے نشاطِ تنہائی
ایک مرکز پہ زیست کھنچ آئی

مٹتی جاتی ہے بنتی جاتی ہے
زندگی کا عجیب عالم ہے

ترا زیرِ لب تبسم تو چمن لٹا رہا تھا
مری تنگ دامنی نے لئے پھول چیدہ چیدہ

یہ تازہ تازہ قفس، کیا خزاں سے کچھ کم ہیں
ہجومِ گل ہی سے اندازۂ بہار نہ کر

میں چلا تھا سیرِ گل کو کہ بہار جوش پر تھی
تری رہگزر جو دیکھی تو بدل گیا ارادہ

ہنگامۂ محفل میں کہیں بھول نہ جاتا
ساقی ترے ہاتھوں میں سبو ہم نے دیا ہے

وفائے یار کو اے دل کہیں نظر نہ لگے
بہت ہی چست ہے اسی جسم پر یہ پیراہن

دل میں طوفان شکایات لئے بیٹھا تھا
اور عنایات نے فرصت ہی نہ دی آج کی رات

بقیہ حالات صفحہ ۱۱۵ کا

دل میں بنا ہے یاد کا مرقد
ویرانے میں پھول کھلا ہے

مدتوں تیرے تصور میں، بچھڑ کر تجھ سے
اپنے سائے پہ بھی تیرا ہی گماں گزرا ہے

تو ساتھ کہاں لیکن اب تک ہر رہگزرِ تنہائی پہ
جو آگے آگے چلتا ہے اے دوست کوئی تجھ سا ہی تو ہے

توڑا ترے سلوک نے نازِ خود آگہی
معلوم اب ہوا کہ ہم اتنے حقیر تھے

زندگی کے مطالبات نہ پوچھ
زندہ رہنے کا حوصلہ نہ رہا

اپنی بستی کی زمیں بھی نہ رہی زیرِ قدم
شہرِ غربت میں ستاروں کا جہاں بھی نہ ملا

نگاہِ شوق کا ذوقِ تجسس بڑھتا جاتا ہے
وہ جتنے چھپتے جاتے ہیں نمایاں ہوتے جاتے ہیں
یہ کس نے سازِ دل چھیڑا، یہ کس کے غم کی لے گونجی
شبِ فرقت کے سناٹے غزل خواں ہوتے جاتے ہیں
وہ لمحے جن سے وابستہ رہیں برسوں تری یادیں
اب آزردہ بھی اک خوابِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں

گوپال متل

[illegible] ۱۹۰۰ء کو مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں تعلیم کی تکمیل کے لیے لاہور گیا اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہیں کا ہو رہا۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے مشہور ادبی جریدے "شاہکار" کا نائب مدیر مقرر ہوا۔ اس کے بعد کئی روزناموں میں بھی کام کیا۔

۱۹۳۲ء میں "دوراہا" کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہوا جو اب نایاب ہے۔ ایک کتاب نثر میں بھی لکھی ہے جو انگریزی میں ہے۔ اردو اور بعض دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے دلی سے ماہنامہ "تحریک" نکال رہا ہوں۔

اپنے نظریۂ شاعری کے بارے میں میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں شاعر کے نظریے کا اظہار اس کی شاعری سے ہی ہونا چاہیے اور اس کا صحیح اندازہ نقاد لگا سکتے ہیں یا ماہرین نفسیات۔

اصول یا نظریے کی بات میں بالعموم نثر میں کہتا ہوں جو میرے نزدیک مربوط افکار کے اظہار کا بہتر ذریعہ ہے۔ بہرحال میری شخصیت کے ایسے کچھ گوشے ضرور ہوں گے جن کا اظہار صرف شعر ہی میں ہو سکتا ہے ورنہ میں شعر نہ کہتا۔

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکاں کا دیا ہوں

خزاں چمن سے مرے بار بار گزری ہے
مگر ہلاکِ فسونِ بہار گزری ہے

سر میں ہوائے دشتِ جنوں ہے بھری ہوئی
شہرِ خرد کی خاک مگر چھانتا ہوں میں

ٹوٹا ہے اپنے زعمِ وفا کا طلسم آج
محسوس ہو رہا ہے کہ تو بے وفا نہ تھا

کیا کہیں دیر و حرم سے کتنی مایوسی ہوئی
وہ تو کہیے میکدے کا در ابھی تک باز تھا

کمالِ ضبطِ محبت ارے معاذ اللہ
زباں کو جیسے کوئی دل سے [illegible] نہیں

یوں دل کو چھیڑ کر نگہِ ناز جھک گئی
چھپ جائے کوئی جیسے [illegible] پکار کے

واقف

مختصر سوانح حیات: سید یعقوب الحسن نام اور واقف تخلص۔ اکتوبر [illegible] میں ولادت ہوئی۔ اردو فارسی کی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی۔ شاعری کا اوائل عمری ہی سے ذوق و شوق رہا۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تقریباً چودہ ڈگریاں الہ آباد، لکھنؤ، پنجاب یونیورسٹیوں سے حاصل کیں۔ ابتدا میں کئی ہائی اسکولوں میں پرشین ٹیچر رہا اور پھر چند کالجوں میں لکچرار۔ ۲۲ سال فلمی دنیا میں افسانہ نویسی کی۔ بعد میں خرابی صحت کی بنا پر بمبئی چھوڑ دیا اور کیمپ کالج دہلی میں ایم۔ اے کے درجات کو فارسی اور اردو کی تعلیم دی ۱۹۷۲ء میں دیال سنگھ کالج دہلی سے رٹائر ہوا۔ جنوری ۱۹۷۶ء سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے ادبی خدمات کے پیش نظر مبلغ سات ہزار روپیہ سال کا اعزازی وظیفہ مقرر ہوا۔ تاکہ ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ دہلی میں ہی قیام ہے۔

نظریہ شاعری: شعر گوئی کی تعریف تحصیل حاصل ہے۔ اصناف سخن میں غزل کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن۔ شاعری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صرف غزل کافی نہیں۔ بلکہ رفتار زمانہ اور ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر شاعر کو بھی اپنے جذبات کو ایک حد تک حالات کا پابند بنانے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے اور سماج کی اخلاقی قدریں بیدار رہیں وقت کی نبض کے ساتھ ساتھ قومی کردار کو بلند کرنے کی کوشش ہی دور حاضرہ کی بہترین شاعری قرار پا سکتی ہے۔

عید کے عنوان پر کچھ اشعار قطعات مرسل ہیں۔

کچھ بات کی تو سنکے حیا سے سمٹ گئے
گر سامنا بھی ہو گیا رستے سے کٹ گئے

اس عید کا بھلا ہو۔ بہانہ تو مل گیا
ہم بے تحاشا دوڑ کے ان سے لپٹ گئے

ہلال عید کی مانند دید ہو جائے
نقاب الٹ دو کہ اپنی بھی عید ہو جائے

مسرتوں میں گھٹا غم کی دل پہ چھائی ہے
ہیں تم سے دور تو پھر کیا جو عید آئی ہے

حسرت دید کے کب پھول یہاں کھلتے ہیں
عید کا دن ہے تصور میں گلے ملتے ہیں

بقیہ [illegible]

گلزار زتشی دہلوی

[illegible] زتشی نام، قوم کشمیری پنڈت، برہمن زاد گلزار تخلص، دہلوی، سکونت اجداد از دورِ شاہجہانی تا ایں دم۔ شاعری موروثی و پشتینی، قیام گلی کشمیریاں بازار سیتارام دلّی۔ تاریخ پیدائش سات جولائی ۱۹۲۶ء ہے۔

اتفاق دیکھیے پیدا بڑے معزز، علمی و ادبی اور محترم گھرانے میں ہو گیا۔ قادر الکلام علامہ پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ صاحب زار دہلوی یادگارِ داغ والدِ بندہ زار محترم، شریمتی برج رانی وکٹوریہ زتشی بیزار دہلوی والدہ محترمہ، دونوں شاعر اور موروثی شاعر، علم و ادب اور تہذیب و شرافت، اخلاق و ادب اور تمدن و ثقافت میں "ننہیال" اور "ددھیال" دونوں جانب سے نجیب الطرفین ادب و نسب۔ اکتسابی و نصابی حصولِ علم، اسلامی دینیات، تصوف، انشاء اور اصناف القدما کے ساتھ فارسی اور بدیہی عربی، ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، جانشین و داماد داغ، و بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے حاصل کیا۔ شاعری میں ۱۹۳۰ء میں حکمت استاد علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی یادگارِ حالی سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ ہندو ویدانت اور فلسفہ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی اور پنڈت دینا ناتھ مدن محجز دہلوی سے حاصل کیا۔ دلی سے میٹرک، پری پیریٹری، بی اے، اور پھر مشترک ایم اے، ایل ایل بی کے جوائنٹ کورس تک دو سالہ تعلیم حاصل کی۔ ہندو کالج دلّی و لا کالج دلّی یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کیں اور فارغ التعلیم ہوا۔ علامہ کیفی کی زیرِ تربیت و ہدایت ادیب فاضل و منشی فاضل بھی پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں تمدنی ادبی و ثقافتی دورے پر مدعو ہو کر ممالک ہائے مغرب (یورپ) اور مغربی ایشیا و مشرقِ وسطیٰ کے متعدد دیاروں کی سیاحت کی۔

جرمنی، برلن میں عالمی امن میلہ میں [illegible] کے ادبی مقابلے و معرکے میں "امن پر مناظرہ" میں شرکت کی اور دنیا کا دوسرا "یوتھ ورلڈ پرائز" یعنی عالمی امن کے نوجوان ملک الشعراء کے مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔ نواب احمد سعید خاں آف چھتاری نے القاب سونے کا تمغہ اور "گلزار سخن" کا خطاب علی گڑھ مشاعرہ دربار نمائش میں عطا کیا۔ ۱۹۵۴ء میں موڈرن پوئٹس سوسائٹی رجسٹرڈ جے پور نے جے پور میں عوامی و

ادبی شہریوں [illegible] استقبال دیا اور تقریب جشن مقدم میں
بدست جناب رام کشن [illegible] وزیر امور خانہ
(اس وقت کے) راجستھان ایک طلائی تمغہ اور
"شاعر فصیح البیان" کا خطاب عطا کیا۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک دہلی کلاتھ ملز
میں سر شنکر لال جنرل ڈائریکٹر کا مشیر ادبیات اور
گزٹ آفیسر رہا۔ ۱۹۵۳ء سے بہ ایما مولانا آزاد مرحوم
C.S.I.R (سائنسی تحقیق کا کونسل) سے متعلق ہوں
اور فی الوقت "پبلیکیشنز آفیسر" ہوں۔ ماہنامہ
نظام نئی دہلی کا برسوں سے اعزازی مدیر معاون ہوں
ہفتہ وار "دور جدید" دہلی کا "اردو نمبر ۱۹۵۰ء"
میں نے ہی تالیف کیا جو آج تک یادگار سمجھا
جاتا ہے۔

"ایشیا" ویکلی اور "ندائے اتحاد" پندرہ روزہ
کے ادبی حصوں میں بھی میرا مشورہ شامل رہتا ہے
تقریباً دو درجن سیاسی، ادبی، سماجی، تہذیبی،
معاشرتی اور تمدنی جماعتوں، اور انجمنوں و اداروں
کا صدر، نائب صدر، جنرل سیکرٹری۔ ڈائریکٹر
یا بانی و مشیر وغیرہ ہوں۔

زبان اور ادب کی خدمت، تحفظ اور تبلیغ
کو "جز و ایمان" اور مقصد حیات سمجھتا ہوں۔
۱۹۳۳ء سے یعنی آٹھ نو برس کی عمر سے شعر
کہتا ہوں یعنی عمر اور مشق شعر تقریباً بیس برس
ہو چکی ہے۔ مضامین ابھی تقریباً ۱۹۔۲۰ سال
سے لکھ رہا ہوں۔

نظریۂ فن: امن عالم، انسانیت [illegible]
ہندو مسلم اتحاد اور [illegible]
تصوف اور ہندو ویدانت پر مبنی آفاقیت اور
وحدت نوعِ البشر کی تبلیغ اور اردو کا تحفظ و اشاعت
عوامی زندگی، قوتِ عمل اور امید افزا و حیات آفریں
مستقبل کی تعمیر اور حال کی استواری کے لئے [illegible]
قابل استعمال بنانا باقتضائے فن اور نظریۂ جمالیات
و شاعری سمجھتا ہوں۔

غزل، رباعی، قطعہ، نظم ہر صنف سخن پر
طبع آزمائی کر لیتا ہوں مگر رجحان طبع نظم کی طرف زیادہ
اور میلانِ طبیعت، معاشرتی و قومی و بین الاقوامی
موضوعات اور تعمیری و صحت مند مسائل کی جانب
زیادہ ہے۔

ارتقائے ادب میں بتدریج مطالعہ کے لئے
بھی اور تقلید کے لئے بھی جن کے کلام سے متاثر ہوا
ان میں نظیر اکبرآبادی، مرزا غالب، مومن خاں مومن
نواب مرزا داغ، ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال، پنڈت
برج نرائن چکبست، پنڈت دیا شنکر نسیم، مولانا
حسرت موہانی، علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی،
شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری
احسان دانش اور فیض احمد فیض حضرات کا نام باعث
سرفہرست سمجھئے۔

زبان و بیان، تخیل اور موضوع [illegible]
اسلوب ان سب کو پیکر شعر [illegible]
لئے مساوی [illegible]

[illegible] تحصیل اور مواد کے
[illegible] لئے ادب برائے ادب
[illegible] زندگی کی تقسیم نہیں کرتا بلکہ دونوں
[illegible] جانتا ہوں مقصدیت اور تفریح و تفنن
[illegible] لطیف اور ذوق سلیم کی جان سمجھتا ہوں ۔
[illegible] محبان وطن کا شکوہ ۔

داغ سینے میں ہیں ایسے کہ دکھا بھی نہ سکوں
اس [illegible] نقش پہ مبنی ہے چمن کی تنظیم
میں جو چاہوں تو اسے ڈھنگ پہ لا بھی نہ سکوں

[illegible] سے ابھریں ہزار تہذیبیں
اسی میں نقش تمدن سمائے ہیں کیا کیا

[illegible] کیا دور زندگی گزرا
واقعے ہو گئے کہانی سے

[illegible] میں ادا ہوئے سجدے
[illegible] نماز کیا جانیں
کون مومن ہے کون کافر ہے
رند یہ امتیاز کیا جانیں

[illegible] میں جوہر فکر جواں ہے میری
[illegible] طرز بیاں ہے میری
دلی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اردو جسے کہتے ہیں زباں ہے میری

چند اشعار

حالِ ناکامی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

——— میر درد

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

——— میر

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ !
بس آج کی رات بھی سو چکے ہم

——— میر حسن

سودا! خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
میری تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے سے

——— سودا

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کیلئے

——— شیفتہ

بیٹھئے، سنئے اب افسانۂ فرقت مجھ سے
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا
وہی جھگڑا ہے فرقت کا، وہی قصہ ہے الفت کا
تجھے اے داغ! الجھی اور بھی افسانہ آتا ہے

——— داغ

کئی عنوان تو ایسے ہیں کہ تڑپا دیں گے
ختم تک کون سنے گا مرے افسانے کو

——— بیخود

محمود سعیدی

حالات

پیدائش : دسمبر ۱۹۳۴ء

مولد : ریاست ٹونک

شعر گوئی کا ذوق اپنے والدِ مرحوم صاحبزادہ احمد خاں صاحب نازش سے ورثے میں پایا، جو اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے پختہ گو شاعر تھے۔ شعر گوئی کا آغاز بارہ سال کی عمر میں ہوا۔ والد صاحب کے علم میں جب یہ بات آئی تو شروع شروع انھوں نے اس خیال سے کہ تعلیم میں ہرج واقع ہوگا کافی حوصلہ شکنی کی لیکن جب دیکھا کہ میں اپنے اس شوق سے باز آنے والا نہیں ہوں تو نہ صرف یہ کہ میری شعر گوئی کی مخالفت ترک کر دی بلکہ میرا حوصلہ بھی بڑھایا اور اس فن کے بہت سے رموز و نکات وقتاً فوقتاً ذہن نشین کراتے رہے۔ میری ذہنی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ والدِ مرحوم ہی کا رہا ہے۔

۱۹۵۳ء سے میں دہلی میں مقیم ہوں اور اندازاً دس برس سے ماہنامہ "تحریک" میں بہ حیثیت نائب مدیر کام کر رہا ہوں۔ مکتبہ تحریک ہی سے ۱۹۶۰ء میں کلام کا پہلا مجموعہ "گفتنی" کے نام سے شائع ہوا اور دو سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپا۔

شعر گوئی کے محرکات ابتداً کیا تھے۔ یہ اب خیال نہیں لیکن اب جو چیزیں مجھے شعر گوئی پر مائل ہیں وہ بھی اتنی متنوع اور گوناگوں ہیں کہ چند سطروں میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ "گفتنی" کے آغاز میں "تعارف" کے عنوان سے جو نظم شامل ہے اس سے کسی حد تک میرے ذہنی میلانات کا سراغ مل سکتا ہے۔

حوصلہ تیرے تصور نے بڑھا رکھا ہے
ورنہ اس ہستیِ ناکام میں کیا رکھا ہے

یوں سلسلہ خیال کا ٹوٹا ہے تیرے بعد
جیسے کسی نے خواب سے چونکا دیا مجھے

اُن کو رخصت بھی کر ہی دیں گے ہم
یہ گھڑی بھی گزر ہی جائے گی

کھو گئے کہاں اور کب، رات کے مسافر سب
سر بہ سنگ رہی ہے اب، شمعِ رہگذر تنہا

باقی

رام کرشن مضطر

۲۰ اگست ۱۹۲۶ء کو بلند شہر (اتر پردیش) ایک قصبہ گوڑ میں پنڈت دوارکا پرشاد کے گھر پیدا ہوا جو ہندی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ آبائی پیشہ زمینداری اور کاشتکاری تھا۔ گوڑ کے نزدیک ہی موضع شیخ پور میں ہماری زمین تھی۔ میری تربیت درست انداز سے ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد خورجہ پہنچا لیکن یہاں درسی کتابوں کے بجائے شاعروں کی تصانیف کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا مگر باقاعدہ شعر گوئی ۱۹۴۵ء میں اختیار کی جب مولانا ضیاء الحسن صاحب ضیا اور مولوی ناصر علی صاحب ناسف خورجوی نے حوصلہ افزائی کی اور خورجہ اور بلند شہر کی ادبی محفلوں میں پذیرائی ہوئی۔

جولائی ۱۹۴۹ء میں دلّی آ گیا کچھ دن جناب سندر شیام پرویز کے رسالہ شعاعیں میں کام کیا۔ اگست ۱۹۴۹ء میں روزنامہ ملاپ نئی دلّی کے ادارہ میں جگہ ملی۔ تب سے اب تک ملاپ ہی سے وابستہ ہوں۔

میری زندگی پڑھتے رہنا ہے۔ اردو نظم و غزل پر ہی میری توجہ صرف ہوتی ہیں لیکن فارسی شاعر کا [illegible] سے روابط زیادہ ہیں۔ ۱۹۶۳ء کے آغاز میں حکومتِ ایران کی دعوتِ خاص پر آج کے ایران کی تعمیر و ترقی، تہذیب و تمدن اور زبان و ادب سے استفادہ کرنے کے لئے ایران گیا اور ایرانِ جدید پر مضامین لکھے۔

گذشتہ اکیس برس میں بہت کچھ جو شائع ہوا ہے۔ منتخب نظمیں، غزلیں اور گیت نثر بھی ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ صحت مند اور حیات آفریں ادب کی تخلیق ہی میرا نظریۂ شاعری ہے۔

جب غم و درد کے آغاز کی یاد آتی ہے
التفاتِ نگہِ ناز کی یاد آتی ہے

ہائے وہ بزمِ چمن، سازِ طرب، رقصِ بہار
رَس میں ڈوبی ہوئی آواز کی یاد آتی ہے

وہ شبِ ماہ، وہ دریا، وہ سکوتِ ساحل
مستیٔ چشمِ فسوں ساز کی یاد آتی ہے

جاگ اٹھتی تھیں تمناؤں کی سوئی کلیاں
جنبشِ زلف کے اعجاز کی یاد آتی ہے

اشکِ غم ہیں کہ لئے بیٹھا ہوں عکسِ انجام
اے محبت! ترے آغاز کی یاد آتی ہے

جب کبھی ہوتی ہے مرے دل میں کوئی تازہ خلش
اُس نگاہِ غلط انداز کی یاد آتی ہے

عشق ہے حافظ و سعدی کے چمن سے مضطر
مجھ کو دلّی میں بھی شیراز کی یاد آتی ہے

سوانح حیات اور نظریۂ شعر

میرا نام عزیز احمد ہے۔ وارثیہ سلسلے میں بیعت ہوں اس لئے عزیز وارثی کہلاتا ہوں۔ قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد یوپی میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی اور شاعری کا شوق بھی وہیں سے ہوگیا تھا۔ بچھرایوں سے بغرض حصول تعلیم دہلی چلا آیا۔ یہاں شاعری کا نشہ ایسا چڑھا جس کا اترنا تا حیات اب مشکل ہے۔ غزل قطعہ رباعی کی طرف طبیعت عام طور پر چلتی ہے۔ نظمیں بھی کافی لکھی ہیں مگر غزل میری محبوب صنف ہے جس میں تصوف کی آمیزش لازمی و ضروری ہے۔ ایک مرتبہ آل انڈیا ریڈیو کے ایکسٹرنل ڈیپارٹمنٹ نے اسی طرح کا پروگرام مجھے دیا تھا جس میں اپنا نظریۂ شاعری مع ثبوت پیش کیا تھا۔

میرا نظریۂ شاعری تصوف آمیز تغزل ہے۔ یعنی دنیا کے حسن میں خدا کے حسن کو تلاش کرنا ہے۔ اس مادہ پرستی کے دور میں میری یہ بات بہت سے لوگوں کو بُری معلوم ہوگی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہی وہ وادی ہے جہاں دل کو اطمینان اور قلب کو سکون میسر ہوتا ہے۔ بات چل رہی تھی سوانح حیات کی نظریہ شاعری کی وضاحت بھی ساتھ ساتھ ہوگئی خیر۔ نواب سراج الدین سائل دہلوی کے بعد حضرت نوح ناروی سے اصلاح لی۔ سفینہ و ساحل کے نام سے ۱۹۵۱ء میں پہلا کلام چھپا۔ یہ اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ اب نظموں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ فروری ۱۹۶۵ء سے پندرہ روزہ ندائے اتحاد کا ایڈیٹر ہوں۔

تیرے جلوؤں سے مجھے جب آگہی ہو جائے گی
ذرّے ذرّے سے نمایاں روشنی ہو جائے گی

اہل ایمان تجھ کو اے کافر
احتیاطاً صنم نہیں کہتے

بے تکلف کبھی اپنے ہی رُخِ زیبا پر
زلف اُس شوخ کی خم ہو تو غزل ہوتی ہے

سینۂ شاعر غم سے بھرا ہے آنکھ [illegible]
روزِ ازل سے [illegible]

تعلیمی رپورٹ

فتحپوری مسلم ہائیر سکنڈری اسکول دہلی

علم کی بدولت انسان عقل وشعور، فہم وفراست اور وسعت قلب ونظر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ علم کے نور سے جہالت کی تاریکیاں تار تار ہوتی ہیں اور تعصب کی گھٹائیں چھٹتی ہیں۔ علم ہی سے انسان ایک ایسا عنصر بن جاتا ہے جس پر جہل وفریب کا وار کارگر نہیں ہو سکتا۔ علم کی ہی کرنوں سے سیاست، مذہب اور ادبی نقش ونگار سے آراستہ ہوتے ہیں۔ علم ہی کی بھٹی میں انسان کی فطری جبلتیں اور صلاحیتیں تپنے کے بعد کندن ہو کر نکلتی ہیں اور کہیں فضاؤں میں شعر ونغمہ کی روح پھونکتی ہیں تو کہیں مادی ترقیات کے پہیوں کو تیز رو کرتی ہیں۔ ایک طرف روح کی غذائیں تیار کرتی ہیں تو دوسری طرف تصوف وعرفان کے چشمے جاری کرتی ہیں۔ علم ہی سے انسان شجر وحجر، چرند وپرند سے ممتاز ہے، ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، نباتات وحیوانات پر حکمراں ہے، پہاڑوں کو روندتا ہے، دریاؤں کے رخ موڑتا ہے، سمندروں کو تسخیر کرتا اور فضاؤں میں پھریرے اڑاتا ہے۔

اس لیے ہر زمانے میں علم کی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ اسی لیے خداوند عالم نے انسان کو جو بے علم تھا علم سکھایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۔ (قرآن)۔ علم کی اہمیت کے پیش نظر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اطلبوا العلم ولو کان بالصین علم حاصل کرو خواہ چین میں کیوں نہ ہو۔ تعلموا العلم وعلموہ الناس ـــ علم سیکھو اور انسانوں کو سکھاؤ۔ علم کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دنیا میں مکاتیب، پاٹھ شالائیں، یونیورسٹیاں اسکول اور کالج جیسے ادارے قائم ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ان ہی اداروں میں فتحپوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول بھی ہے جو برسوں سے تشنگان علم کی پیاس بجھا رہا ہے اور جس کے علمی کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس ادارے کی مفصل تاریخ گذشتہ لوح وقلم کے شمارے میں درج کی جا چکی ہے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ جہاں اس پر

حافظ محمد صدیق صاحب مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب جیسی علمی شخصیتیں، محمد عطا صاحب جیسے حضرات کی نظر کرم رہی ہے۔ یہاں اس کی سرپرستی حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم جیسے جلیل القدر علماء بھی فرماتے رہے ہیں۔ ان حضرات نے اسکول کو مالی تعاون بھی دیا اور حادثات روزگار سے محفوظ رکھا۔ خصوصاً ۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور کے بعد اس ادارے کی احیاء ثانی کا سہرا انھیں حضرات کے سر ہے۔

سال رواں میں اوقاف کی عدم توجہی کی وجہ سے اسکول کو زبردست مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی حالات ناسازگار ہونے کے سبب عمارت، فرنیچر سب خستگی کا شکار ہو گئے۔ طلباء کے لیے فرنیچر تو درکنار ٹاٹ کے فرش پر بیٹھنا بھی مشکل سے نصیب ہونے لگا۔ جگہ جگہ سے پلاستر اکھڑ جانے سے خاک اڑنے لگی۔ پانی اور بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ کلاسیں بلیک بورڈ اور چاک کو ترسنے لگیں۔ ان صبر آزما حالات میں عوام اور خواص کی ہمدردیاں نہ صرف اسباب تسکین مہیا کرتی رہیں بلکہ انھوں نے اپنا دست تعاون بھی ضروری عطیات کے ساتھ بڑھایا۔ بالخصوص جناب حاجی محمد فاروق صاحب آل کلاتھ والوں نے بجلی کا انتظام اور اس کی مرمت اپنے ذمے لی اور نے پارٹیشن کرا کر اسکول میں [illegible] کیا۔

جنابہ بیگم حاجی محمد [illegible] صاحب [illegible] والوں نے ایک نئے کمرے کی تعمیر کرا کے اس کو بجلی و فرنیچر سے آراستہ کیا۔ جناب [illegible] صاحب نے واٹر پمپ عنایت کیا۔ ایک صاحب خیر نے مؤثر عنایت فرما کر پانی کا مسئلہ مستقل طور پر حل کرا دیا۔ جناب حافظ محمد عثمان صاحب ایران گھڑی و گمنٹ نے اپنی خصوصی توجہ مبذول فرما کر اسکول کی واٹر پائپ لائن تبدیل کرا کر پانی کا انتظام درست کرا دیا۔

جناب حاجی محمد حسن صاحب، جناب محمد سلطان و جناب محمد اقبال صاحب، جناب حافظ عبد العزیز صاحب، جناب حاجی نواب صاحب، جناب محمد عارفین صاحب، جناب ریاض الدین صاحب، میسرز کشمیر چپل سٹور، حاجی نعیم الدین صاحب، جناب سید حسین صاحب، جناب محمد امین صاحب، جناب محمد معین صاحب، جناب محمد نسیم صاحب، جناب محمد عیسیٰ صاحب، جناب محمد یحییٰ صاحب، جناب محمد تقی صاحب کی عنایات سے فرنیچر کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا۔

جناب عبد الرشید صاحب مالک [illegible] پینٹ ہاؤس نے اسکول کے پارٹیشن پر رنگ کرایا۔ جنابہ فہمیدہ بیگم صاحبہ زوجہ حافظ [illegible] جناب محمد [illegible] صاحب [illegible] نے

[illegible] کے بعد دیگر حضرات نے
[illegible] بڑا کر دست [illegible]
[illegible] جو [illegible]
[illegible] ۱۹۸۰ء میں اسکول کی
[illegible] پوری ہو گئیں۔ جناب
[illegible] صاحب نے ممبر کی حیثیت سے
[illegible] ذمہ داریاں قبول فرمائیں اور جناب
حاجی محمد فاروق صاحب آٹے کا تھوک والوں نے
مجلس منتظمہ کی رکنیت قبول فرمائی۔ ان دونوں حضرات
نے [illegible] شب و روز کی انتھک کوششوں سے
اسکول کو مالی بحران سے نجات دلائی۔

منتظمہ کمیٹی اسکول ہذا

اچھا نظم و نسق کسی ادارے کی روح ہوتا
ہے۔ منتظمہ کمیٹی اگر قابل، تجربہ کار اور پرخلوص اراکین
پر مشتمل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ادارہ ترقی نہ کرے۔
[illegible] ہے کہ ہمارے اسکول کی مجلس منتظمہ جملہ خوبیوں
[illegible] کی حامل ہے۔ اس کے اندر اگر
ایک طرف تجار، وکلا، صحافی اور ادیب نمائندگی
کرتے ہیں تو دوسری طرف علماء، فضلاء اور رہنمایان
[illegible] شامل ہیں۔ حضرت مولانا مفتی
[illegible] صاحب عثمانی ایک جلیل القدر ہستی
ہیں [illegible] نے ہر آزمائش اور مشکل میں ہمیں
[illegible]

[illegible]

[illegible] جناب [illegible] احمد صاحب ایک طویل
عرصہ سے ہمارے اسکول کی مجلس منتظمہ سے
وابستہ ہیں اور بڑے سے بڑے مسائل کو چٹکیوں
میں حل فرما دیتے ہیں۔ اس سال سے آپ نے
ممبر/سکریٹری کی حیثیت سے نئی ذمہ داری کو
سنبھالا ہے اور الحمد للہ آپ کی اور جناب حاجی
محمد فاروق صاحب آٹے کا تھوک والوں نے مجلس
منتظمہ کی ممبرشپ قبول فرمائی ہے۔ اور یہ انہیں
حضرات کے تدبر، فراست اور تجربوں کا فیض
ہے کہ گذشتہ چند ماہ میں اسی ادارے کو
ایک بہت بڑے مالی بحران سے نجات حاصل
ہوئی۔

جناب مولانا محمد میاں صاحب، جناب
م،م، احمد ایڈوکیٹ، جناب نواب سلطان
یار خاں صاحب، جناب سید عزیز الشفیع صاحب
کی خدمات بھی سنہرے حروف میں لکھے جانے
کے قابل ہیں۔

جناب شیخ الحاج محمد عمر صاحب لیس والے
اسکول کے جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ ہر ہر قدم
پر ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ مشکل سے مشکل
مسائل کا حل نہایت غور و خوض کے ساتھ نکال کر
رکھ دیتے ہیں۔

جملہ عہدیداران اور اراکین کمیٹی کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی	صدر
۲۔	جناب میر مشتاق احمد صاحب	منیجر/سکریٹری
۳۔	" شیخ الحاج محمد عمر صاحب لیس والے	جوائنٹ سکریٹری
۴۔	" مولانا محمد میاں صاحب	رکن
۵۔	" الحاج محمد فاروق صاحب آئل کلاتھ والے	"
۶۔	" سید عزیز الشفیع صاحب مجسٹریٹ درجہ اول	"
۷۔	" نواب سلطان یار خاں صاحب ایڈوکیٹ	"
۸۔	" محمد احمد صاحب ایڈوکیٹ	"
۹۔	" ایس۔ ایس۔ ورما صاحب پرنسپل	" (نمائندہ محکمہ تعلیم)
۱۰۔	" سدا نند صاحب شاستری پرنسپل	" (بحیثیت ماہر تعلیم)
۱۱۔	" زین العابدین صاحب، پرنسپل سکول ہذا	"
۱۲۔	" غلام احمد علمی صاحب، استاد سکول ہذا	"
۱۳۔	" شاہ مصطفٰے صاحب سامانی "	"
۱۴۔	" ریاض عمر صاحب، لیکچرار دلی کالج	"
۱۵۔	" شیخ محمد الیاس صاحب دہلوی	"
۱۶۔	" مبارک اللہ خاں صاحب لوہانی برسر اسکول ہذا	(مشیر)

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

ہر اسکول کے لیے اس کے سابقہ طلباء کی محبت رگ جاں کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے اسکول کے قدیم طلباء کی انجمن بہت عرصے سے اسکول کی فلاح و بہبود اور نادار طلباء کی امداد کے لیے کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے

یہ انجمن ہر سال اسکول ہال میں سیرۃ النبی کے جلسے بھی منعقد کراتی ہے جس میں ملک کے جلیل القدر علماء کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس سال بھی ایک شاندار جلسۂ سیرۃ پاک اسکول ہال میں منعقد کیا گیا جس میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور

صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ جناب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی نے صدر کے فرائض انجام دئے اور جناب مولانا ابوالحسن صاحب نے جلسے کے اختتام پر دعا فرمائی۔ اسی جلسے میں جونیر اور سینیر طلباء کو جو سیرت پاک کے تحریری مقابلوں میں اول، دوم و سوم آئے، کو انعامات تقسیم کئے گئے۔

انجمن والدین واساتذہ

ادارے اور طلباء کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ اور والدین کا باہمی تعاون ہو۔ دونوں مل کر طلباء کے مسائل پر غور کریں۔ شخصیت کی تعمیر اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع نکالیں۔ اس مقصد کے لیے اسکول میں انجمن اساتذہ و والدین طلبا قائم ہے۔ جس کی وقتاً فوقتاً نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں اور طلباء کے مسائل کو سمجھ کر ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

اسکول کے ان بیرونی معاملات کے ذکر کے بعد یہ ضروری ہے کہ اسکول کے اندرونی حالات کا جائزہ بھی ناظرین کرام کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

یہ ادارہ ۱۹۵۹ء میں ہائی اسکول سے ہائر سکنڈری بنا اور اس وقت سے اب تک اسی معیار پر مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس کو ۱۹۶۰ء سے دو شفٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سیکنڈ شفٹ کے انچارج جناب قریب خاں صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی، جناب مشیر الحسن صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی اور جناب انوار الدین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ رہے ہیں۔ اور ان حضرات نے انچارج شپ کے فرائض انتظامیہ بحسن وخوبی انجام دیے ہیں اور اب پی جی ٹی گریڈ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور اس وقت انچارج پنڈت موہن لال شرما ہیں جو اپنے فرائض منصبی کو تندہی اور خوبی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

طلباء

طلباء قوم وملک کے معمار ہی نہیں بلکہ مستقبل کے شہری بھی ہوتے ہیں۔ انھیں پر قوم کی ترقی کا انحصار ہے۔ الحمدللہ اس اسکول کو اپنے طلباء کے نظم وضبط اور صلاحیتوں پر فخر ہے۔ اس اسکول کے طلباء فطری صلاحیتوں اور جبلّتوں کے حامل ہیں اور ہر میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں انھوں نے مختلف علوم میں نام پیدا کیا ہے وہاں دیگر ہمنصابی Action میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ کھیل کا میدان ہو یا پلیٹ فارم ہمارے طلباء وہاں بہترین پارٹ ادا کرتے ہیں۔

اس وقت اسکول میں طلبہ کی تعداد ۱۴۰ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے بہت سے طلبا کو داخلے سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ عنقریب اسکول میں نئے کمروں کے اضافے کے بعد یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس وقت اسکول میں چھٹی سے گیارہویں جماعتوں تک ۲۰ سیکشن ہیں۔

تعلیم

اس مادی ترقی کے دور میں آرٹس کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کامرس اور سائنس کی تعلیمات کی اہمیت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اب راکٹوں اور ایٹمی ایجادات کا دور ہے۔ اس لیے اسکول کے ارباب اختیار کی نظر تعلیم کے ہر پہلو پر رہی ہے۔ اسی لیے تین سال قبل سے اسکول میں شعبۂ سائنس کا اجرا کر دیا گیا تھا۔ اسکول کی تعلیمی سرگرمیوں کا حال مندرجہ ذیل سطور میں شعبہ وار پیش کیا جاتا ہے۔

شعبۂ آرٹس اس شعبے کے تحت انگریزی، اردو، فارسی، عربی، ہندی، سوکس، اکونومکس، تاریخ اور ڈرائنگ جیسے اہم مضامین کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر دی جاتی ہے۔ اس شعبے میں نہایت قابل، تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ تعلیم کے جملہ فرائض کما حقہ انجام دے رہے ہیں۔

علم تمدن اور تاریخ کے طلبا کو ملک کے اندر قدیم تاریخی معلومات کے حصول کے لیے مشہور تاریخی عمارتوں اور مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ نیز علم تمدن کے طلبا کو وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ کے اجلاس کی کارروائی کے مشاہدے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

شعبۂ سائنس اسکول میں سائنس کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ کیمسٹری اور فزکس کی تعلیم کے لیے بڑی بڑی تجربہ گاہیں ہیں۔ قابل اساتذہ سائنس کی تعلیم دینے پر مامور ہیں۔ گو سائنسی آلات کی کمی کے سبب ہم ذرا پیچھے ہیں پھر بھی اس شعبے نے کافی ترقی کی ہے۔ ہمارے طلبا نے سائنس کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا ہے۔ اس شعبے سے ہمیں کافی توقعات ہیں جن کی تکمیل کے لیے بڑی محنت اور جانفشانی کی ضرورت ہے۔

اس شعبے کے اندر انجنیرنگ گروپ کے مضامین مثلاً ریاضی، کیمسٹری، فزکس علاوہ لازمی مضامین کے پڑھائے جاتے ہیں۔ جماعت ششم سے بچوں کو سائنس کی نئی اسکیم کے تحت یونیسکو (UNESCO) معیار کے مطابق سائنسی تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے لیے اسکول میں یونیسکو ٹائپ کا دیدہ زیب فرنیچر مہیا کیا گیا ہے۔

آئندہ سال سائنس کلب کا قیام ہم بھی

[illegible] کام علم شامل ہے۔ اس کلب کے قیام [illegible] طلبہ میں سائنس کے ذوق میں اضافہ ہوگا اور [illegible] سائنس [illegible] ہوگا۔

شعبۂ کامرس

تجارت موجودہ معاشرے کی روح ہے۔ تجارت پر ہی ملک کی ترقیات کا دارومدار ہے۔ اسلام اور بانیٔ اسلام حضور اکرمؐ نے بھی ہمیشہ تجارت کو سراہا ہے۔ الحمدللہ اسکول میں کامرس کے شعبے نے بہت ترقی کی ہے۔ کامرس کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ اور اس کے بورڈ کے سالانہ نتائج کا اوسط ہمیشہ ۹۰ فیصدی سے زیادہ رہا ہے۔ کامرس کے طلباء تعلیم میں خصوصی امتیاز کے حامل ہیں۔ اسکول کے مختلف تعلیمی اور تعمیری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اسکول میں کامرس سوسائٹی پچھلے دو سالوں سے قائم ہے جس کا افتتاح جناب میر مشتاق احمد صاحب منیجر اسکول ہذا نے فرمایا تھا۔ اسی وقت انھوں نے بچوں کی دوکان کا افتتاح بھی کیا جس کو کامرس سوسائٹی چلاتی ہے۔ بچوں کی دوکان نہایت کم منافع پر بچوں کو اشیائے خوردنی، اسٹیشنری اور کتابیں سپلائی کرتی ہے۔ آمد و خرچ کا حساب سب طلباء کرتے ہیں۔

اس طرح انھیں تجارت کرنے کی عملاً تربیت دی جاتی ہے۔ اس شعبے میں بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹس اور طریقہ تجارت، معاشیات کے علاوہ عربی، فارسی، ریاضی اور اردو ہندی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

اخلاقی اور دینی تعلیم

یہ ضروری خیال کیا گیا کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم بھی دی جائے تاکہ طلباء کی روحانی غذا کا سامان ہوتا رہے اور انھیں اخلاقی پستی اور ذہنی گراوٹ سے نجات ملتی ہے۔ صبح کو دینی موضوعات اور اخلاقیات پر اسکول شروع ہونے سے پہلے درس دیا جاتا ہے۔ بچوں کو بنیادی عقائد، مسائل اور نیک عمل کی تعلیم و ترغیب دی جاتی ہے۔ جناب مختار احمد صاحب علوی کی سرگرمیاں اس سلسلے میں ستائش اور تحسین کے الفاظ سے مستغنی ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول ہذا کے ایک طالب علم حافظ محمد یونس نے بھی دینیات کی تعلیم کا ایک اچھا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

سیکنڈ شفٹ میں طلباء کو نماز کے لیے خصوصی رخصت دی جاتی ہے۔ سیکنڈ شفٹ کے طلباء کی دینی رہنمائی کے سلسلے میں جناب محمد عاقل صاحب اور جناب عارف شہید صاحب ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔

اس سال موسم گرما کی تعطیلات کے دوران جمعیت بلڈنگ میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے امید ہے کہ طلباء اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کریں گے۔

آئندہ کے لیے ہمارا یہ پروگرام ہے کہ طلباء کے لیے ایک دینی نصاب مقرر کیا جائے جو ہر جماعت کے لیے الگ الگ ہو اور سال کے آخر میں ان کا امتحان بھی ہو لیکن اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دینیات کے ۲ اساتذہ کی ضرورت ہوگی ہمیں امید ہے کہ اہلِ خیر حضرات اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

فزیکل ایجوکیشن

صحت مند دماغ کے لیے صحت مند جسم ضروری ہے۔ کمزور اور بیمار طلباء نہ تعلیم میں ترقی کر سکتے ہیں اور نہ جسمانی محنت کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لہذا بچوں کی صحت اور تندرستی کے لیے سکول میں فزیکل ایجوکیشن کی لازمی طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ہفتے میں نصابِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر جماعت کے لیے تین گھنٹے پی۔ٹی کے لیے وقف رہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ۲ تربیت یافتہ پی۔ٹی۔آئی صاحبان مقرر ہیں ہمیں افسوس ہے کہ کھیل کے میدان میں ہم خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے ہیں جس کی ایک وجہ فیلڈ کی عدم دستیابی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے طلباء فٹ بال اور کرکٹ کے اچھے کھلاڑی ثابت ہوتے ہیں اور ان کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔

اس سال سے National Efficiency Drive کی اسکیم پر بھی عمل شروع ہوا۔ اس اسکیم کے تحت بچوں کا مختلف ورزشوں میں امتحان لیا جاتا ہے اور ان کو تندرست بننے کی ترغیب دی جاتی ہے کامیاب طلباء کو سرٹیفکٹ دئے جاتے ہیں۔

این۔سی۔سی (N.C.C)

طلباء کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ملٹری ٹریننگ بھی دی جاتی ہے تاکہ طلباء بحیثیت ایک فوجی کے ہنگامی حالات میں ملک کے اندرونی نظم و نسق کو بخوبی سنبھال سکیں۔ اسی وجہ سے ہمارے اسکول میں N.C.C کا ایک عمدہ یونٹ قائم ہے جس میں طلباء اپنے دلیرانہ جذبے کا شاندار مظاہرہ کرتے ہیں اور قوم و ملک کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں۔ ہر سال N.C.C کا ایک کیمپ کسی پہاڑی مقام پر لگتا ہے جس میں ہمارے طلباء نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ اور مقابلوں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

اسکاؤٹنگ

اسکاؤٹنگ ایک نیم فوجی تنظیم ہے جس کی ضرورت اور اہمیت تمام عالم میں تسلیم کی جاتی ہے۔ ہمارے اسکول کو اس تنظیم پر فخر ہے۔ ہمارا اسکول اسکاؤٹنگ میں ہمیشہ امتیازی شان حاصل کرتا رہا ہے۔ بستی زون کے مقابلوں میں ہمیشہ اول اور دوم پوزیشن حاصل کی ہے۔

اور انعامات: ٹرافیاں، شیلڈ اور سرٹیفکٹ حاصل کئے ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ سات اساتذہ اسکاؤٹنگ کی تربیت حاصل کر چکے ہیں اور انھیں کی صلاحیتوں کا یہ ثمرہ ہے کہ اسکول میں نہایت شاندار اسکاؤٹ گروپ قائم ہے۔ اس سلسلے میں حاجی مرزا رحم علی صاحب محمد قریب صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انوار الدین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ افتخار احمد صاحب بی۔ کام۔ بی ایڈ۔ اور ارشد رشید صاحب ایم اے۔ بی۔ ایس سی بی ایڈ کی خدمات قابل تحسین ہیں۔

اسکول پارلیمنٹ

آزاد ہندوستان میں جمہوری قدروں کی نشوونما کے لیے یہ ضروری ہے کہ طلبا کو جمہوریت کے لوازم کی تربیت دی جائے۔ انھیں اپنے ووٹ کی قدر، فرض شناسی نیز حقوق شناسی کا سبق سکھایا جائے تاکہ مستقبل کے یہ شہری صحیح جمہوری تربیت حاصل کرکے اپنے ملک کی جمہوریت کو کامیاب بنا سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسکول میں پارلیمنٹ کا قیام کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء سے اب تک اسکول پارلیمنٹ کا بذریعہ انتخاب انعقاد ہوتا ہے۔ اور کیبنٹ کی تشکیل کی ہے۔ اس سال اسکول پارلیمنٹ کے صدر محمد محمود خاں متعلم جماعت یازدہم اور سکریٹری غوث محمد متعلم جماعت دہم اے رہے۔

اسکول پارلیمنٹ اسکول کے اندر ہونے والے فنکشنز کا انتظام کرتی ہے۔ مباحثے و مذاکرے وقتاً فوقتاً منعقد کراتی ہے تاکہ طلبا کو تقریر کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ اس سال پارلیمنٹ کے زیر اہتمام یو۔ این۔ او ڈے اور آزاد ہند فوج کا سلور جوبلی ڈے اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔

ادبی کارکردگی

ہمارے اسکول نے سال رواں میں تقریری مقابلوں میں صرف حصہ ہی نہیں لیا بلکہ حسب ذیل انعامات حاصل کرکے دنیائے ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ چنانچہ ۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو امروہہ میں سیرت النبی کمیٹی کی جانب سے منعقدشدہ تقریری کل ہند مقابلوں میں اسکول ہذا نے تین انعامات حاصل کئے۔ پہلا انعام ٹرافی اور شیلڈ کی شکل میں سلطان محمود نے حاصل کیا۔ دوسرے دو انعامات خصوصی غوث محمد نے حاصل کئے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کامرشل ہائر سکنڈری سکول میں اردو ہندی انگریزی مشترکہ تقریری مقابلہ ہوا اس مقابلے میں بھی غوث محمد نے دہلی کے تمام اسکولوں میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس بحث کا عنوان تھا " اس ایوان کی رائے

میں عدم تشدد ہی کے ذریعے بنی نوع انسان کو
جنگ کے ایٹمی تازیانوں سے بچایا جا سکتا ہے"۔

۵ رفروری ۱۹۶۹ء کو سام جس ہائر سکنڈری سکول میں ایک تقریری مقابلہ ہوا جس میں دلی کے بہت سے اسکولوں نے شرکت کی تھی۔ ہمارے اسکول سے اس مقابلے میں بھی غوث محمد نے تیسرا انعام حاصل کیا۔

۷ مارچ ۱۹۶۹ء کو A.S.J.V ہائر سکنڈری اسکول دریا گنج میں تقریری مقابلے میں بھی غوث محمد نے انعام حاصل کیا۔

اسکول کلینک اور طبّی امداد

ہمارے اسکول میں طبی امداد کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر مسٹر جے گوپال کھنہ صاحب پارٹ ٹائم طور پر روزانہ بیمار طلباء کا معائنہ کر کے دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ اور طلباء کو یہ دوائیں اسکول سے مہیا کی جاتی ہیں۔ کمزور بچوں کو ٹانک اور وٹامن کی گولیاں تقسیم کی جاتی ہیں اور ہر بچے کا جسمانی معائنہ کیا جاتا ہے جس کا پورے طور پر ریکارڈ رکھا جاتا ہے تاکہ کمزور اور بیمار و صحت مند بچوں کی صحیح تعداد معلوم ہوتی رہے اور اسی کے مطابق دواؤں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

جونیر ریڈ کراس

جنگی حالات میں ریڈ کراس کے رفاہی کام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ تحریک عالمی ہے اور جنگ، قحط، طوفان زدہ علاقوں میں اس کی سرگرمیاں قابل تحسین ہوتی ہیں۔ ہمارا اسکول بھی جونیر ریڈ کراس کا ممبر ہے اور اسکول میں بچوں کو فرسٹ ایڈ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسکول میں صفائی کی دیکھ بھال اور بند و بست اور صاف پانی کا انتظام بھی اسی سوسائٹی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ بیماریوں سے بچنے کی احتیاطی تدابیر چارٹ کے ذریعے سمجھائی جاتی ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن

موجودہ زمانے میں سائنس کے ان کرشموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور جب یہ ذرائع تعلیم کے لیے ہونے لگیں تو ان کی اہمیت اور بھی دو چند ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حکومت کی طرف سے ہمارے اسکول کو دو ٹیلی ویژن سیٹ عنایت کئے گئے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اسباق ہوتے ہیں اور ان کے لیے الگ سے پیریڈ مقرر ہیں۔ انگریزی، سائنس اور سماجی علوم کی تعلیم حسب پروگرام ٹیلی ویژن پر دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ روزانہ دو گھنٹے کے لیے رات کو ٹیلی ویژن پر معلوماتی اور تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ اس پروگرام کے انچارج اس سال سے محمد محبوب صدیقی صاحب [illegible]

مقرر کئے گئے ہیں جن کی نگرانی میں اس پروگرام سے طلباء اور اساتذہ کمیں ٹیلی کلب استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

فلم پروجیکٹر

اسکول میں ایک قسم پروجیکٹر بھی ہے۔ جس کے ذریعے وقتاً فوقتاً طلباء کو تعلیمی اور معلوماتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

اسکول لائبریری اور ریڈنگ روم

کتابیں انسان کی بہترین رفیق اور ساتھی ہیں۔ اچھی کتابیں اچھے طالب علم بنانے میں ضروری ہیں۔ اسکول لائبریری اچھے طالب علم بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہماری لائبریری میں قدیم وجدید دونوں قسم کی کتب کا ایک عمدہ ذخیرہ موجود ہے کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۴ ہزار سے زائد ہے طلباء کو کتابیں ہفتے میں ایک بار لائبریری سے دی جاتی ہیں۔ لائبریری کی طرف سے لوح قلم ایک وال میگزین بھی لگایا جاتا ہے جس میں دنیا کی معلومات تصویروں کی زبانی پیش کی جاتی ہیں امسال لائبریری کو نئے طرز سے آراستہ کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی لائبریری کو کامیاب بنانے کے لیے کافی محنت اور جانفشانی کی ضرورت ہے

ریڈنگ روم میں ۲۶ سے زیادہ اخبار اور رسائل آتے ہیں۔ جو ہندی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں ہوتے ہیں۔ طلباء کے خاموش مطالعے کے لیے ریڈنگ روم کو اچھی طرح فرنیچر وغیرہ سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔

پسماندہ طلباء کی امداد

اس سال حکومت کی طرف سے اقتصادی حیثیت سے پسماندہ طلباء کو 4000 روپے کے وظائف دیے گئے۔

ہمارا مستقبل کا پلان

ان تمام عملی اقدام کے باوجود جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ابھی ہماری ضروریات باقی ہیں جن کے پورا ہونے کے لیے ہمیں اپنی کوششوں کے ساتھ ساتھ پبلک کے تعاون کی بھی بے حد ضرورت ہے۔ سب سے اولین مسئلہ عمارت میں اضافے کا ہے جو اہل خیر حضرات کی اور محکمہ تعلیمات کی توجہ سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اگر اسکول میں ۷، ۸ کمروں کا اور اضافہ ہو جائے تو یہ ممکن ہے کہ ایک بوائز شفٹ کے ساتھ ساتھ دوسری شفٹ طالبات کی تعلیم کے لیے لگ سکے۔ اور طالبات کے لیے ایک علیحدہ مسلم اسکول قائم ہو سکے۔

دوسرا مسئلہ کھیل کے میدان کا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں کئی دفعہ اوقاف اور لیفٹننٹ گورنر صاحب کو توجہ دلائی ہے۔ لیکن ابھی تک ہمیں کوئی اسکول کے نزدیک کھیل کا میدان نہیں مل سکا ہے۔ انشاء اللہ ہم اپنی

کوششیں جاری رکھیں گے۔ اور امید ہے کہ
فیلڈ مہیا ہو جانے پر ہم کھیل کے میدان میں
سبقت لے جا سکیں گے۔

ہمارا یہ بھی پلان ہے کہ بچوں کی صحیح
vocational رہنمائی کی جائے۔

نویں جماعت سے ہی بچوں کو یہ بتایا
جائے کہ وہ کس کورس میں داخلہ لیں۔ بعض
اوقات بچے بلا سوچے سمجھے اس شعبے میں داخلہ لے
لیتے ہیں جو آگے چل کر ان کے لیے موزوں نہیں
رہتا۔ اس لیے بچوں کے رجحان کو سمجھنے کے
بعد ان کی رہنمائی کی جائے۔ اور ہائر سکنڈری
کے امتحان کے بعد بھی ان کی صحیح رہنمائی کی
جائے کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کریں۔

ہمارا یہ بھی پلان ہے کہ اسکول میں صنعتی
تربیت کے لئے بھی صنعتی تعلیم کا بندوبست
کر دیا جائے تاکہ طلبا صنعتی تعلیم حاصل کر کے
ملک کے تعمیری منصوبوں میں حصہ لے سکیں۔

اسکول میں ایک Biology سیکشن
کی بھی سخت ضرورت ہے کیونکہ اسی علم سے طلباء
ڈاکٹر بن سکتے ہیں۔ اس لیے اس سال منتظمہ
کمیٹی اور محکمہ تعلیمات کی توجہ اس طرف مبذول
کرائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری خیال کیا جاتا
ہے کہ اسکول میں جو معزز حضرات اور علماء کرام
تشریف لاتے رہتے ہیں ان کی رہائش کے لیے
ایک مہمان خانہ تعمیر کیا جائے۔ جس کا نام —
"مجاہد ملت منزل" رکھا جائے۔

آئندہ آل انڈیا اردو ڈبیٹ رننگ
ٹرافی کے مقابلے کے انعقاد کا بھی پروگرام
ہے۔

اس کا نام بھی مجاہد ملت حضرت مولانا
حفظ الرحمٰن مرحوم صاحب کے نام پر مجاہد ملت
ٹرافی ہوگا۔ اس میں تمام ہندوستان کے طلباء
کو شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔

اسمائے گرامی اساتذہ

فتحپوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول دہلی ۶

۱۔ جناب زین العابدین صاحب ایم، کام، بی، ایڈ پرنسپل
۲ " محمد رفیق صاحب ایم، اے، بی، ٹی وائس پرنسپل و پی، جی، ٹی (اکونومکس)
۳۔ " مبارک اللہ خاں صاحب لوہانی، بی، ایس سی۔ بی، ٹی برسر سکول ہٰذا
۴۔ " انوارالدین صاحب ایم، اے۔ بی، ایڈ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (سوکس)
۵۔ " ضیاءالدین خاں صاحب ایم، اے۔ ایم ایڈ، ڈی، ایف، اے " " " (تاریخ)
۶۔ " محمد قریب خاں صاحب ایم، اے بی ٹی لینگویج ٹیچر (فارسی) گریڈ I
۷۔ " مشیر الحسن صاحب جھنجھانوی ایم اے۔ بی ٹی " " (اردو) گریڈ I
۸۔ " محمد نبی صاحب ایم اے (عربی، اردو) بی ایڈ " " (عربی) گریڈ I
۹۔ " اکبر علی صاحب ایم ایس سی (فزکس) پی۔ جی۔ ٹی (فزکس)
۱۰۔ " نسیم احمد انصاری صاحب ایم ایس سی (کیمسٹری) پی جی ٹی (کیمسٹری)
۱۱۔ " پران ناتھ ملہوترا صاحب ایم ایس سی، بی ایڈ پی جی ٹی (ریاضی)
۱۲ " پنڈت موہن لال شرما ایم اے (آنرز) ہندی انچارج سیکنڈ شفٹ
۱۳ " غلام احمد صاحب علمی فاضل ادبیات (اردو، فارسی عربی)
۱۴۔ " فرقان احمد صاحب بی اے، بی ایڈ
۱۵۔ " محمد عارف شہید صاحب ایف اے، ایچ پی، ایچ یو
۱۶۔ " اختر حسن صاحب ایم اے۔ بی ایڈ
۱۷ " محمد عتیق صدیقی ایم اے۔ بی ایڈ
۱۸ " سید محمد جلالی زیدی صاحب بی ایس سی۔ بی ایڈ
۱۹ " دلدار احمد صاحب انصاری ایم اے۔ بی ایس سی۔ بی ایڈ
۲۰ " افتخار احمد صاحب علوی بی کام۔ بی ایڈ
۲۱ " ارشد رشید صاحب ایم اے۔ بی ایس سی۔ بی ایڈ

۲۲۔ جناب محمد محبوب صدیقی صاحب بی کام۔ بی ایڈ
۲۳۔ " سید ستار شاہ صاحب بی اے۔ بی ایڈ
۲۴۔ " محمد یوسف صاحب (ایچ ایس) ہے وی۔ ایچ یو
۲۵۔ " مرزا رحم علی صاحب ایس وی
۲۶ " مولانا عبدالقدیر الاعظم عباسی فاضل ادب (عربک ٹیچر)
۲۷۔ " شاہ مصطفےٰ اسامانی ڈرائنگ ٹیچر
۲۸۔ " امیر احمد صاحب " "
۲۹۔ " محمد عاقل صاحب شمیم ایم اے۔ بی ایڈ
۳۰۔ " ہمفری ہربرٹ صاحب پی ٹی آئی
۳۱ " آرتھر ویزلی صاحب بی اے۔ ڈی پی آئی۔ پی ٹی آئی
۳۲۔ " سہیل احمد صاحب صدیقی ایم اے۔ بی ایس سی ڈمانسٹریٹر
۳۳۔ " شفقت عزیز صاحب ایم کام آفس انچارج
۳۴۔ " عبدالحفیظ عباسی صاحب بی اے۔ بی لب۔ ایس سی لائبریرین
۳۵۔ " مختار احمد علوی صاحب ایچ پی۔ ایس ایس لیب اسسٹنٹ
۳۶۔ " عمر دراز خاں صاحب ایف ایس سی لیب اسسٹنٹ
۳۷۔ " ڈاکٹر جے گوپال کھنہ ڈی آئی ایم ایس اسکول میڈیکل آفیسر

مُلازمین درجہ چہارم

۱۔ جناب سعید الدین صاحب چپراسی
۲۔ " علی حسین صاحب (لا دیب میٹرک) چپراسی
۳۔ " شیر بہادر چوکیدار
۴۔ " عبدالوحید ڈسٹ مین
۵۔ " جمال الدین واٹر مین
۶۔ " فتح رام خاکروب

اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی